عہدِ رسالت مآب ﷺ میں سماجی انصاف اور فلاحِ معاشرہ۔۔۔ عہد بعہد ارتقاء

پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد*

Social Justice and Welfare of Society in the Era of Prophet (Peace be Upon Him) … Historical Evolution

Abstract

The development of social justice and welfare of society is an evolutionary process based on consistent effort. This paper intends to trace out the evolutionary process of development of social justice and welfare of society in the era of the Prophet (Peace be Upon Him) by discussing the initiatives taken by the prophet (Peace be Upon Him) in this regard in historical perspective. The article discusses the above mentioned evolutionary process by analyzing the major initiatives taken by the prophet (Peace be Upon Him) in Makkan and Medinian era for the establishment of social justice and welfare of society and trace out the practical guidance for the establishment and development of a society based on social justice and welfare.

تمہید

اصولی طور پر سماجی / معاشرتی انصاف اور فلاحِ معاشرہ لازم و ملزوم حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی بھی معاشرہ کی فلاح، معاشرے میں سماجی انصاف کی فراوانی پر موقوف ہے۔ جس معاشرے میں انصاف کے بر عکس ناانصافی ہو، ظلم و جبر کا دور دورہ ہو، اس معاشرہ میں انسانی قدروں کی پامالی، حقوق انسانی کی ناقدری، ظلم و ستم کی ارزانی، اونچ نیچ، طاقتور کمزور کی کشمکش اور اپنی انتہاؤں میں قتل و غارتگری، فساد و تضاد، بد امنی، بے اطمینانی، دہشتگردی اور بالآخر تباہی اور بربادی پھیل جاتی ہے اور مزید بُرے نتائج رونما ہوتے ہیں۔

چھٹی صدی عیسوی کے اس دور میں جبکہ آنحضرت ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے، دنیا کے تمام ملکوں اور خطوں میں عموماً اور عرب معاشرہ میں خصوصاً، مؤخر الذکر معاشرہ کی تمام خصوصیاتِ فاسدہ نمایاں طور پر پائی جاتی تھیں، یعنی معاشرہ فلاح و کامرانی سے دور سماجی انصاف سے محروم اور سیاسی، معاشی، مادی، اخلاقی، ہر قسم کے تباہی اور بربادی سے دوچار تھا۔ قرآن میں اس صورت حال پر تبصرہ بہ ایں الفاظ درج ہے {ظَهَرَ ٱلْفَسَادُ فِي ٱلْبَرِّ وَٱلْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي ٱلنَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ ٱلَّذِي عَمِلُوا۟ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝٤١}[1] {خشکی اور تری، ہر جگہ فساد ہی فساد برپا تھا۔ لوگوں کے اپنے کرتوت کا نتیجہ، تاکہ مزا چکھائے ان کو (اللہ) ان کے بعض اعمال کا (نتیجہ) شاید کہ وہ (آئندہ) کے لئے باز آجائیں (اپنی

---

* سابق صدر شعبہ اسلامی تاریخ، کراچی یونیورسٹی، کراچی

1- سورۃ الروم:۴۱

حرکتوں سے)}۔

معاشرہ: بنیادیں

معاشرہ (مل جُل کر رہنے والے) انسانوں کے مجموعہ کا نام ہے[1] جو کسی نہ کسی (مشترکہ) بنیاد پر مجتمع ہوں۔ سماجی علوم کے مطابق یہ بنیاد، رنگ، نسل، خاندان، زبان اور وطن، کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ (یہی بنیادیں عام طور پر مشہور و معروف اور مقبول عند الناس ہیں)۔ البتہ یہاں معاشرہ اور سماج کی نوعیت اور دیگر متعلقات کی بحث میں پڑے بغیر اپنے مجوزہ موضوع بحث (سماجی انصاف اور فلاحِ معاشرہ سیرت رسول ﷺ کی روشنی میں) کے مطابق یہ جاننا اہمیت رکھتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں جو معاشرہ پروان چڑھا وہ اپنی اساس اور بنیاد پر اور متعینہ مقاصد کے تحت کب اور کس طرح وجود میں آیا؟ نیز وہ معاشرہ اپنی توسیع اور تکمیل کے اگلے درجے میں کس طرح بصورت ریاست متشکل ہوا؟ اور پھر اپنے مفروغ اور کمال کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے کامیابی و کامرانی سے کس طرح ہمکنار ہوا؟ یہاں تک کہ وہ آئندہ آنے والے تمام زمانوں کے لئے منارۂ نور ثابت ہوا اور آج تک ضوفشاں ہے۔

مکی جاہلی معاشرہ

تاریخ بتاتی ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ محسن انسانیت، حضور سرور عالم ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے تو عربی مکی معاشرہ (دوسرے معاشروں کی طرح) خون، نسل، خاندان اور زبان و وطن کی روایتی بنیادوں پر استوار تھا۔ اس پر مستزاد اہلِ عرب اپنے وطن، اپنی زبان کی وسعت، فصاحت و بلاغت پر اس درجہ نازاں تھے کہ باقی دنیا کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور انہیں "عجم" یعنی "گونگا" قرار دیتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ ایک اور وجہ سے بھی اپنے تئیں دوسروں پر فوقیت کے دعوے دار تھے۔ ان کے مرکزی شہر مکہ مکرمہ میں خانہ کعبہ موجود تھا جو اپنی تعمیر و تاریخ کے حوالے سے تو اصلاً اللہ کا گھر تھا، تاہم اس وقت وہ دنیا کا سب سے بڑا بُت خانہ بنا ہوا تھا۔ گویا اس کے مقدس و محترم ہونے کا کوئی شک کسی کہ نہ تھا۔ اس مقدس گھر کی محافظت و مجاورت پر اہلِ عرب کا معزز گھرانہ قریش مقرر تھا۔ وہ گھر بہر حال بلا کی مقناطیسیت رکھتا تھا جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے عرصہ قدیم سے عشاق و زائرین وقتاً فوقتاً اور سال میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور ساری دنیا کے مختلف حصوں سے

1- عربی زبان میں معاشرہ کے لُغوی معنٰی یہی ہیں، لیکن یہ لفظ چونکہ ثلاثی مزید کے باب مفاعلہ پر مبنی ہے اس لئے بنیادی خصوصیات میں اشتراک، موافقت اس کا لازمہ ہے۔ چنانچہ بطور رکن معاشرہ ہر فرد کا ایک دوسرے سے جُڑا رہنا ہے۔ اور مشارکت و موافقت اختیار کرنا فطری تقاضہ ہے۔

سفر کی زحمتیں اٹھا کر آتے تھے اور قریش مکہ کی مہمانی کا لطف اٹھاتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ مقدس گھر بھی ملک عرب کی عزت و شہرت کا باعث تھا اور ان کے اس افتخار و اعتبار کو یہ اقتضائے عالم مستند مانا جاتا تھا۔

یہاں یہ ذکر ایک اہم حقیقت سامنے لاتا ہے اور وہ یہ کہ خون، نسل، خاندان، اور وطن و زبان کی بنیادیں، اجتماعی و انفرادی دونوں سطح پر "آدمی" کے خیال میں "برتری" کا ایک "خناس" پیدا کر دیتی ہیں جو بجائے خود فخر و غرور، گھمنڈ کے بے پناہ جزبات پیدا کر کے آدمی کا دماغ خراب کر دیتی ہیں اور پھر وہ آپے میں نہیں رہتا۔ چنانچہ اس وقت مکی معاشرے کے امراء، زعماء، ملاء، کے دماغوں میں "برتری کا خناس" بُری طرح گھسا ہوا تھا اور اپنے نتائج بد دکھاتا رہتا تھا۔ اس "احساس" نے ان میں ایک طنطنہ پیدا کر دیا تھا کہ اپنے سوا کسی اور کی بات سننا گوارا نہ تھا۔ یہ طنطنہ، گھمنڈ اور غرور قریش مکہ کا خاصہ بن چکا تھا۔ قبیلہ قریش کے مختلف خاندان مکہ مکرمہ اور اس کے اطراف و مضافات میں آباد تھے۔ عرصہ دراز سے سیادت و قیادت انہی کے ہاتھ میں تھی۔ ظہورِ اسلام کے وقت شہری مملکت مکہ قائم تھی، اس کے مختلف شعبے مختلف عہدے تھے جن پر اشراف و اعوان مقرر تھے۔ اس کی تفصیل یہاں ممکن نہیں۔ مکہ مکرمہ اور اس کے اطراف (**ام القری ومن حولھا**) میں رہنے والے اور سماج کا حصہ بننے والے صرف قریش نہیں تھے، ایک متنوع معاشرہ ہونے کے سبب سماج کے مختلف عناصر، مختلف طبقات وہاں آباد تھے۔ آزاد شہری، ملکی، غیر ملکی، اشراف، غلام لونڈی کا طبقہ، تجار، صناع، کاریگر، محنت کش مزدور طبقہ، طاقتور اور کمزور طبقات، پھر وہاں کے مخصوص خاندانی نظام کے تحت ولاء اور حلف سے جُڑنے والے مختلف حوالوں سے ان کے بُطون وغیرہ، اجتماع و طبقات کی مختلف بنیادیں تھی، جن میں نمایاں (دین و ایمان نہیں بلکہ) خون، نسل، خاندان اور دوسری رعایتیں تھیں۔ اس لئے خود قریش بہت سے ٹکڑوں میں بٹے ہوئے تھے، مثلاً مقام و مرتبہ اور رہائش کی بنیاد پر قریش البطائح اور قریش الظواہر، قبائلی شرف، سماجی منزلت اور اقتصادی دولت کی بنیاد پر مکی ریاست، اور انتظامیہ میں ذمہ داریاں اور عہدے اور پھر موروثی طور پر ان کی منتقلی۔ قریش الظواہر کے پاس کوئی منصب نہیں رہا۔

بقول ایک مصنف:

> "بعثت محمدی کے قریب قریش بطائح کے بارہ بڑے قبیلے، خاندان اور بطون، مکی سیاست اور سماج، انتظامیہ کے مالک تھے، ڈیڑھ دو صدی میں بنو قصی کا خاندان یا بطن پانچ بڑے خاندانوں یا بطون میں منقسم ہو چکا تھا"۔[1]

1- دیکھیے۔ ابن خلدون، تاریخ ابن خلدون۔، دار الفکر، بیروت، ط ثانیہ 1988ء، ج2، ص401۔ مزید تفصیل کے

سماجی اور اختلافی رویوں کے اختلاف کی وجہ سے الاحلاف اور المطیبون کے الگ الگ طبقے بن گئے۔ المطیبون بنو عبد مناف کے حامی بطون پر مشتمل تھا، اور اس میں بنو تمیم، بنو زہرہ، بنو اسد، بنو حارث بن فہر شامل تھے جبکہ الاحلاف میں بنو عبد الدار اور ان کے حمایتی بطون بنو مخزوم، بنو جمح، بنو سہم اور بنو عدی بن کعب شامل تھے۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ عامر بن لوی اور محارب بن فہر کا تھا جو فریقین میں سے کسی کے ساتھ شامل نہ تھا اور غیر جانب دار رہا۔[1]

مختلف قبائل اور خاندانوں میں رقابت اور حمایت کی ایسی بہت سی مثالیں ہیں جن کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ مکی جاہلی معاشرہ ایک بھرپور سماجی عناصر و طبقات پر مشتمل تھا اور غیر خدائی معاشروں والی تمام خصوصیات وہاں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ بہر حال مکی جاہلی معاشرے میں ہر قسم کے طبقات اور محبت و رقابت کے متنوع تعلقات و مفادات کا ٹکراؤ اور نزاع بھی پایا جاتا تھا جس کے نتیجے میں مستقل عداوت و دشمنی و جنگ وجدال تک نوبت پہنچ سکتی تھی۔ قریش کے علاوہ دوسرے عرب قبائل بھی مکہ میں آباد ہوئے اور بعض عرب بدوی قبیلوں یا ان کی شاخوں نے مکہ مکرمہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی پھر مسلم خلفاء موالی سے زیادہ قریش کے غیر مسلم خلفاء اور موالی کی تھی اور ان کا تعلق مختلف عرب قبائل سے تھا۔ مکہ مکرمہ کی آبادی میں یہ غیر مسلم عناصر سماجی، اقتصادی اور تہذیبی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔[2]

مکی نبوی معاشرہ

حضور سید عالم ﷺ، جو داعی حق اور فخر انسانیت بن کر تشریف لائے تھے اس وقت جب کہ ایک نئی تہذیب کی آبیاری آپ ﷺ کے پیشِ نظر تھی، اور ایک نئے معاشرہ اور ایک نئے مجتمع کی آپ ﷺ تشکیل فرما رہے تھے اس لئے صلاح اور فلاح کی بسم اللہ کرتے ہوئے آپ ﷺ نے معاشرہ میں پھیلی ہر جھوٹی بات اور فکر و خیال کے تمام خس و خاشاک پر لا الہ کا تیشہ چلا کر ذہن و فکر کی زمین کو ہموار و استوار کیا اور

لئے دیکھیے۔ صدیقی، مولانا ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر، اسوہ نبوی، ناشر القم، کراچی، ۲۰۰۸، ص ۲۵۔

1- صدیقی، مولانا ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر، اسوہ نبوی، ناشر القم، کراچی، ۲۰۰۸، ص ۲۵۔

2- ایضاً، محولہ بالا

محض الا اللہ کی ایک ہی ضرب سے ایک نیا چمنستان خیال اور ایک نیا گلشنِ فکر و عمل لہلہانے لگا۔[1] یہاں تک کہ زمین و آسمان کی کئی وسعتوں میں یہ آوازہ سنائی دیا گیا کہ برتری و سروری صرف اس ذاتِ بے ہمتا کے لئے جو تحت الثری کی گہرائیوں سے لے کر آسمانوں کی معراج بلکہ آفاق سے بھی پرے قوس حکمرانی بجا رہا ہے۔{وَهُوَ ٱلَّذِي فِي ٱلسَّمَآءِ إِلَٰهٞ وَفِي ٱلۡأَرۡضِ إِلَٰهٞۚ وَهُوَ ٱلۡحَكِيمُ ٱلۡعَلِيمُ ﴿٨٤﴾ وَتَبَارَكَ ٱلَّذِي لَهُۥ مُلۡكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا وَعِندَهُۥ عِلۡمُ ٱلسَّاعَةِ وَإِلَيۡهِ تُرۡجَعُونَ ﴿٨٥﴾}[2]

نبوی معاشرہ کی بنیادیں

یہ تزکیۂ نفس کی وہ منزل تھی جس کے تحت عقیدہ و فکر میں یہ حقیقت توحید بٹھا دی گئی کہ اللہ اپنی ذات و صفات میں یکتا و تنہا ہے اور کائنات کے ذرّہ ذرّہ پر اسی کی بادشاہی و حکمرانی قائم و دائم ہے۔ چنانچہ تمام مخلوق اپنی تمام اقسام میں تکوینی طور پر اسی کے آگے سجدہ ریز ہے۔ {تُسَبِّحُ لَهُ ٱلسَّمَٰوَٰتُ ٱلسَّبۡعُ وَٱلۡأَرۡضُ وَمَن فِيهِنَّۚ وَإِن مِّن شَيۡءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمۡدِهِۦ وَلَٰكِن لَّا تَفۡقَهُونَ تَسۡبِيحَهُمۡۚ

1- یہاں اشارہ تزکیہ نفس کی طرف ہے جو آنحضور ﷺ کے فرائض منصبی میں شامل تھا جس کا ذکر سورۃ البقرہ آیت (۱۰۱)، آل عمران (۱۶۴) اور الجمعہ (۲) میں بالالتزام کیا گیا ہے۔ التزکیہ زکیٰ کا مصدر ہے۔ ارضِ زکیہ (عمدہ زرخیز زمین کو کہتے ہیں، (تاج العروس، ج38 ص224) بقول علامہ راغب "زک و" الزکوٰۃ کے اصل معنی، نمو، افزونی کے ہیں، (المفردات، مترجم ص۳۸۷) وہ مزید لکھتے ہیں کہ "تزکیہ نفس سے ہی انسان اوصافِ حمیدہ کا مستحق ہوتا ہے (ایضاً، ص۳۸۸) لفظ کے اصل معنیٰ میں نشو نما اور پھلنے پھولنے کا مفہوم شامل ہے عملاً کسی کھیتی کو لگانے اور اسے افزائش سے متمتع کرنے کے لئے پہلا ضروری کام یہ ہوتا ہے کہ اس زمین کو خس و خاشاک سے پاک کیا جائے پھر زمین کو نرم اور ہموار اور استوار کیا جائے، پھر تخم ریزی کی جائے اور حفاظت و نگہداشت کا کام کیا جائے تو کھیتی جڑ پکڑتی ہے اور نشو نما پا کر اپنا جوبن دکھاتی ہے۔

2- سورۃ الزخرف: ۸۴، ۸۵۔ "وہی ایک آسمان میں بھی خدا ہے اور زمین میں بھی خدا ہے، اور وہی حکیم و علیم ہے، بہت بالا و برتر ہے وہ جس کے قبضہ میں زمین اور آسمانوں اور ہر اس چیز کی بادشاہی ہے جو زمین و آسمان کے درمیان پائی جاتی ہے"۔ (ترجمہ مودودی) یہ مضمون {وَهُوَ ٱللَّهُ فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَفِي ٱلۡأَرۡضِ يَعۡلَمُ سِرَّكُمۡ وَجَهۡرَكُمۡ وَيَعۡلَمُ مَا تَكۡسِبُونَ ﴿٣﴾} [سورة الأنعام:3]. میں بھی مذکور ہے۔ (ترجمہ: وہی ایک خدا آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی، تمہارے کھلے اور چھپے سب حال جانتا اور جو برائی اور بھلائی تم کماتے ہو اس سے خوب واقف ہے۔ (ترجمہ مودودی)

إِنَّهُۥ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ﴿٤٤﴾}[1]

اس لئے مخلوقاتِ جن وانس بھی از روئے خلقت وجبلّت اللہ رب العالمین کی بندگی وغلامی سے مبرا نہیں ہیں۔

{وَمَا خَلَقْتُ ٱلْجِنَّ وَٱلْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿٥٦﴾}[2]

مختصراً عقیدہ وایمان کی یہی وہ بنیاد واساس تھی جس پر عہدِ رسالت مآب ﷺ میں (نبوی / مکی) معاشرہ کی تاسیس عمل میں آئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ نے دفعتاً خون، خاندان، رنگ، نسل، وطن، زبان وغیرہ کی ہر بنیاد منہدم کرکے (نبوی معاشرہ کی بنیاد) دین، نظریہ، عقیدہ توحید، وایمان پر استوار فرمائی تھی۔

نبوی معاشرہ۔تاسیس وتعمیر

عقیدہ، دین وایمان کی بنیاد پر (نبوی مکی) معاشرہ کو روبہ عمل کرنے کے لئے، آنحضور ﷺ نے (جبلِ نور کی بلندیوں پر غار حرا کی نورانی وسعتوں میں نزولِ وحی اور تلقینِ آیات سورۃ العلق (۱-۵) بواسطۂ جبرائیل روح الامین کے بعد) سر سر آرائے نبوت ورسالت ہو کر دعوتِ حق کا آغاز، دعوت دین وایمان سے کیا جو داخلِ اسلام ہونا چاہتا، کلمہ پڑھتا، ایمانیات کا اقرار کرتا اور اس مجتمع کا حصہ بن جاتا جو اللہ والوں کا تھا جو اس سے پہلے اقرار ایمان سے مشرف ہو چکے تھے۔ یوں اہلِ ایمان اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے جُڑتے چلے گئے۔ بر بنائے ایمان لوگوں کا جُڑتے چلے جانا یہ معنی رکھتا تھا کہ عملاً ایک مجتمع تشکیل پا رہا تھا اور ایک نئے معاشرہ کی داغ بیل حضور نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں پڑ رہی تھی۔

اقرار دین وایمان کے حوالہ سے کئی نکات بہت اہم ہیں اور توجہ چاہتے ہیں:

۱۔ ایک تو یہی کہ اقرارِ دین وایمان کے معاملہ میں بہر حال کسی جبر واکراہ کا دخل نہیں تھا۔ بس مرضی کا سودا تھا۔ سر تا سر ذاتی خوشی، پسند اور رضامندی اصل محرک تھی۔

۲۔ دوسرا یہ کہ یہ صرف زبانی اقرار (اقرار باللسان) تک محدود نہ تھا کہ بس کچھ الفاظ زبان سے صادر ہو گئے بلکہ تصدیق بالجنان اس اقرار کا لازمہ تھا کہ جو الفاظ وزبان سے ادا ہوں اس کی گواہی اس کا دل ضرور دے، مزید براں زبانی اقرار اور قلبی تکرار کے ساتھ ساتھ اس کے اعضاء وجوارح دونوں باتوں کا اظہار

1- سورۃ الاسراء:۴۴

2- سورۃ الذاریات:56

کریں۔

۳۔ تیسرا یہ کہ ایمان کی کیفیت، مومن کے سراپا میں عمل و تحرک کا ایسا جذبہ پیدا کر دیتی ہے کہ ہر ایک دل و جان کی گہرائیوں سے کلمہ پڑھتے ہی لذت ایمان پالیتا ہے اور ایک مومن دوسرے مومن کا دوست، ساتھی، بھائی اور اس سے محبت کرنے والا بن جاتا ہے۔ یہ محبت اور تعلق خاطر خود اس معاشرہ اور معاشرت کا خاصہ تھا کیونکہ عربی زبان میں معاشرہ، مفاعلہ کے وزن پر ثلاثی مزید کا وہ باب بن جاتا ہے جس کی اہم خصوصیت اشتراک و موافقت ہے، گویا رشتہ و وابستگی اور شیفتگی و وارفتگی خود معاشرہ کے ظاہر و باطن میں موجود ہے اس پر مستزاد ایمان کا تڑکا لگتا ہے تو وہ ایسی محبت و مودت میں بدل جاتی ہے کہ جس میں کوئی سفلی مقصد، ذاتی غرض و غایت نہیں ہوتی اور اللہ کی رضا بن جاتی ہے اور حدیث کی رو سے استکمالِ ایمان کی منزل حاصل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہر صاحب کے ایمان کے بعد ہی ظاہر و باطن کی تبدیلی خود بخود پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کے اثرات چال ڈھال، گفتار، کردار ہر ایک نمایاں ہو جاتے، اس کی زندگی بدل جاتی، وہ اخلاق رذیلہ کو ترک کر دیتا اور اخلاق فاضلہ کی اعلیٰ صفات اس کے سراپا کا حصہ بن جاتیں۔ اس کے اخلاق و کردار کا انفرادی حسن اس معاشرہ کے مجموعی حسن کو صلاح و فلاح سے معمور کر دیتا تھا۔ ان حقائق کی تصدیق سورۃ المؤمنون کی ابتدائی 10 / 11 آیات سے بخوبی ہو جاتی ہے۔ فرمایا گیا: {قَدْ أَفْلَحَ ٱلْمُؤْمِنُونَ ۝١ ٱلَّذِينَ هُمْ فِى صَلَاتِهِمْ خَٰشِعُونَ ۝٢ وَٱلَّذِينَ هُمْ عَنِ ٱللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝٣ وَٱلَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَوٰةِ فَٰعِلُونَ ۝٤ وَٱلَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَٰفِظُونَ ۝٥ إِلَّا عَلَىٰٓ أَزْوَٰجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَٰنُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝٦ فَمَنِ ٱبْتَغَىٰ وَرَآءَ ذَٰلِكَ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْعَادُونَ ۝٧ وَٱلَّذِينَ هُمْ لِأَمَٰنَٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَٰعُونَ ۝٨ وَٱلَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَٰتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝٩ أُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْوَٰرِثُونَ ۝١٠ ٱلَّذِينَ يَرِثُونَ ٱلْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ ۝١١}[1]

اوپر کی تفصیل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مکی جاہلی معاشرہ کے پس منظر میں آنحضرت ﷺ کے ہاتھوں (خون، نسل، خاندان، وطن اور زبان کی روایتی بنیادوں کو ٹھکرا کر) دین و ایمان کی بنیاد پر جو (دنیوی معاشرہ) وجود پذیر ہوا وہ دنیا بھر کے تمام شہروں سے بالکل مختلف تھا۔ محض ایک کلمہ اسلام پڑھ کر ایک آدمی

1۔ سورۃ المؤمنون: 1-11

اس نوزائید معاشرہ کا رکن بن جاتا تھا خواہ اس کی نسل، اس کا خاندان، اس کا رنگ، اس کی زبان کچھ بھی ہو اور سیاسی، معاشی، معاشرتی لحاظ سے وہ کوئی بھی درجہ رکھتا ہو۔ مزید بر آں ایمان کا اقرار ہی اس کی زندگی کی ظاہری / باطنی تبدیلی کا سبب بن جاتا تھا اور جو پہلے معاشرہ میں عام سی غیر اہم زندگی گزارتا تھا ایمان لانے کے بعد اس کی زندگی بالکل بدل جاتی تھی۔ نبی ﷺ کے قائم کردہ معاشرہ کا رکن بن کر وہ ہر لحاظ سے ایک اہم فرد بن جاتا اسکی زندگی کا یہ انقلاب آفریں منظر صرف ان حضرات کے یہاں ہی نظر نہ آتا جو پہلے ہی مثبت مؤقف کے مالک اور ایمان وہدایت کے منظر و طالب ہوتے تھے بلکہ وہ مخالفین اور دشمنان دین کی بھی قلب ماہئیت ہو جاتی تھی جو دشمنی و مخالفت میں ید طولی رکھتے تھے۔ ان حوالوں کی تائید اگر ایک طرف حضرات "**السابقون الاولون**" کے نیاز آگیں مثبت ایمانی رویوں سے ہوتی ہے تو دوسری طرف وہ معاندین و مخالفین دین جو ہر قیمت پر اہل ایمان کی صفوں کو درہم برہم کرنا چاہتے تھے مگر جب ان کا آندھی طوفان ساحل ایمان سے ٹکرایا تو تسکین و ایمان پاکر وہیں لنگر انداز ہو گیا۔ اس قسم کے لوگوں کے بارے میں صاحب "رحمۃ للعالمین" مولانا قاضی سلیمان صاحب منصور پوریؒ نے اپنی کتاب میں جابجا تاثرات بیان کئے ہیں۔ ان سب کا حوالہ اور ان کی نقل تو یہاں ظاہر ہے ممکن نہیں اور خواہ مخواہ طول بیانی کا باعث ہو سکتا ہے لیکن کہیں کہیں سے نمونے از خروارے کے مطابق ان کے بیان اور تاثرات کو نقل کرنا خوشگوار اور باعث لطف ومنفعت ہو گا۔

مولانا قاضی سلیمان منصور پوری ایک جگہ رقمطراز ہیں کہ "یہ سب کرشمے اس پاک تعلیم کے تھے جو آہستہ آہستہ دلوں کو فتح کرتی چلی جاتی تھی۔ اکثر انبیاء علیہم السلام نے معجزے دکھائے لیکن نبی ﷺ (فداہ ابي و امي) نے عظیم الشان معجزہ یہ دکھایا کہ دل کو بدل دیا اور روح کو پاکیزہ بنا دیا"۔[1] ایک اور جگہ لکھتے ہیں: دشمن دوست بن گئے اور جان ستاں، جاں نثار ثابت ہوئے ہیں۔ وہ عمرو بن عاص جو نجاشی کے پاس قریش کا سفیر بن کر گیا تھا۔ چند سال کے بعد وہی عمان کے بادشاہ کے پاس داعیٔ اسلام بن کر جاتا ہے اور ہزاروں اشخاص کے مسلمان ہونے کی بشارت نبی ﷺ کی خدمت میں لاتا ہے[2] وہی عروہ بن مسعود جو حدیبیہ میں آنحضرت ﷺ کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے قریش کا سفیر بن کر آیا تھا خود بخود مدینہ میں حاضر ہوتا ہے اور اپنی قوم میں دعوت اسلام کی اجازت حاصل کر کے اسی میں جان قربان کر دیتا ہے۔ وہی سہیل بن عمرو جو معاہدہ حدیبیہ میں بت پرستوں کی جانب سے کمشنر معاہدہ تھا اور جس نے عہد نامہ

1- محمد سلمان منصور پوری، **رحمۃ للعالمین**، دار السلام للنشر والتوزیع، ریاض، ص28۔

2- **رحمۃ للعالمین**، ص870۔

میں اسم پاک محمد کے سامنے لفظ رسول لکھے جانے پر انکار کیا تھا وفات نبوی ﷺ کے بعد بیت اللہ میں کھڑے ہو کر اسلام کی صداقت اور دین اسلام کی تائید میں ایسی زبردست تقریر کرتا ہے کہ سینکڑوں دلوں میں سکینہ اور ایمان بھر دیتا ہے۔ وہی وحشی جس نے امیر حمزہ کو مارا کلیجہ نکالا، اعضاء کاٹے، جنازہ بے حرمت کیا کچھ دنوں بعد مسلمان ہو جاتا ہے تو شرم وخجالت سے منہ سامنے نہیں کرتا اور بالآخر مسیلمہ کذاب کو قتل کر کے اپنی حرکت سابقہ کی تلافی سمجھتا ہے۔ وہی ابو سفیان بن حارث بن عبدالمطلب جو حقیقی چچا کا بیٹا ہو کر بھی نبی ﷺ کی ہجو میں متواتر اشعار کہا کرتا تھا جذبۂ توفیق سے خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور جنگ حنین کے میدان میں وہی اکیلا رکاب نبوی ﷺ تھامے نظر آتا ہے۔ وہ طفیل دوسی جو مکہ میں روئی کی ڈاٹ کانوں میں لگا کر پھرتا تھا کہ محمد ﷺ کی آواز کانوں میں نہ پہنچے بالآخر اپنے وطن میں گھر گھر پھرتا اور محمد ﷺ کی آواز کو پہنچاتا تھا۔ وہ عبد یالیل ثقفی جو طائف میں غلاموں، بچوں کو پتھراؤ کرنے کے لیے پیچھے لگا رہا تھا آخر مدینہ حاضر ہوا اور وہاں سے اپنی قوم کے پاس جواہر ایمان واتقان لایا۔[1]

نبوی معاشرہ کا ارتقاء:(1)

نبوی مکی معاشرہ (جو دین وایمان کی بنیاد پر معرض وجود میں آیا) وہ اپنی خاص نوعیت رکھتا تھا۔ نیز اس کے حلقہ میں داخل ہونے والے تمام افراد واراکین اپنے غیر معمولی سیرت وکردار کا مظاہرہ کرتے ہوئے جاہلی معاشرہ سے بالکل الگ اپنی ایک شناخت رکھتے تھے۔ چنانچہ یہ نوزائیدہ معاشرہ جب سے وجود میں آیا دن بدن ترقی کرتا چلا گیا اور مشکلات وموانعات کے باوجود توسیع کے مراحل سے گزرتا رہا۔ اہل مکہ کو عموماً اور کفار ومشرکین کو خصوصاً سب سے زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ ایمان لانے والا ہر فرد جو ایک مرتبہ کلمہ پڑھ لیتا ہے، اس سے کسی حال میں نہ مکرتا ہے، نہ اسے ترک کرتا ہے۔ شروع شروع کے تین سالوں میں آنحضور ﷺ نے دین وایمان کا بہت زیادہ ڈھنڈورا نہ پیٹا تھا بلکہ آہستگی، خاموشی سے اپنی بات دوسروں تک پہنچائی تھی اس لیے نبوی معاشرہ کے اراکین میں بھی اضافہ آہستہ آہستہ ہوا اور جلد ہی یہ نتیجہ سامنے آنے لگا کہ باشندگان مکہ کے ہر خاندان، ہر قبیلہ میں متفرق طور پر کوئی نہ کوئی شخص یا چند اشخاص دولت ایمان سے متمتع ہو گئے تھے اس لیے پورے شہر میں "اسلام" کا چرچا ہو گیا اور کوئی خاندان قبیلہ ایسا نہ بچا تھا جہاں ایمان کی چنگاری نہ سلگ رہی ہو۔ کفار ومشرکین مکہ کا آنحضور ﷺ پر الزام واتہام ہی یہ تھا کہ صادق وامین نے اپنی دعوت سے ہماری قوم میں تفرقہ ڈال دیا ہے اور ملک وملت میں نفرت کا بیج بو دیا ہے۔ یہ ہلچل بالکل فطری

1۔ ایضاً، ص34۔36۔

تھی۔ ہمارے سیرت نگاروں میں سے جنہوں نے **السابقون الاولون** کا شمار کیا ہے[1] انہوں نے لکھا ہے کہ اولین تین سالوں کے دوران خفیہ تبلیغ کے نتیجہ میں کم از کم 135 حضرات حلقۂ ایمان و اسلام میں آگئے[2]۔

گویا تین سالہ عرصہ میں ہی اہل ایمان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ چکی تھی اور مکی جاہلی معاشرہ بڑے پیمانے پر تغیر سے دوچار ہو چکا تھا (ان تاریخی حقائق کی روشنی میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جن مصنفین نے پورے مکی دور میں ہی آنحضور ﷺ کے متبعین کو انگلیوں پر شمار کر کے بہت محدود رکھا ہے وہ اصل حقائق کا کتنا کم ادراک رکھتے ہیں)۔

نبوی معاشرہ کا ارتقاء:(2)

چونکہ نبوی معاشرہ کی تاسیس و تعمیر کا پہلا دور / مرحلہ (جیسا کہ اوپر بیان ہوا) ابتدائی تین سالوں میں ہی نمایاں ہو کر سامنے آیا، اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ افراد وارا کین معاشرہ ہذا کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس لیے یہ ناقابل یقین نہ ہونا چاہیے کہ خفیہ دور کے بعد / یا خطبۂ کوہ صفا کے بعد یعنی اعلانیہ دعوت کے دوسرے دور میں نبوی مکی معاشرہ توسیع و ترقی کے اگلے دور / مرحلہ میں بہ آسانی داخل ہو گیا۔ یہ دور کل مدت اور عرصۂ عمل کے لحاظ سے خطبۂ کوہِ صفا کے بعد شروع ہوا اور پھر مزید سات سال تک (موانعات، مشکلات، سانحات وغیرہ میں مسلسل اضافہ کے باوجود) کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ دسواں سال نبوت اختتام کو پہنچا اور اہل مکہ اور اس کے ماحول و مضافات کے باشندوں پر آنحضور ﷺ نے ابلاغ حق کا کلی اہتمام کرتے ہوئے، اتمام حجت فرما دیا۔ یعنی اس دوران جتنی بھی سعید روحوں کے مقدر میں فلاح و سعادت لکھی تھی وہ ایمان لے آئے اور انھوں نے طوق اسلام سے اپنے آپ کو مزین کر لیا جبکہ اس کے برخلاف وہ کفار و مشرکین جو بدنصیب تھے، جو زندگی بھر سید عالم ﷺ کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کرتے رہے اور ایمانی / اسلامی / نبوی معاشرہ کو حتی الوسع ارتقاء پذیر ہونے سے روکتے رہے، بالآخر وہ بھی اس نتیجہ تک پہنچ گئے کہ ان کی ہر مخالفانہ سرگرمی بے سود رہی، مظالم، انفرادی اجتماعی ظلم و ستم،

1- اصح السیر مؤلفہ مولانا دانا پوری، ص59 ومابعد۔

2- مولانا مودودی، سیرت سرور عالم، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، طبع اولی 1978، ج2، ص155 تا ص161۔

تنبیہ، تہدید، تعذیب کا ہر حربہ آزمالیا، معاشی معاشرتی بائیکاٹ کرکے دیکھ لیا، لیکن جناب رسالت پناہ ﷺ کی راہ کھوٹی نہ کرسکے۔ چنانچہ اب وہ منزل آگئی ہے کہ کوئی آخری فیصلہ کرلیا جائے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔[1]

نبوی معاشرہ کا ارتقاء:(3)

3 نبوی سے لے کر10 نبوی تک کا یہ زمانہ تاریخی طور پر حقائق وواقعات سے بھرپور ہے بلکہ ان سب کا بیان وحوالہ بھی موجب طوالت ہوسکتا ہے۔ اس لیے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو نبوی معاشرہ کے ارتقاء کے اسی دوسرے مرحلہ تک محدود رکھیں گے البتہ وضاحت کے لیے بعض حقائق وواقعات تاریخ کی طرف اشارہ، منظر موثر بہ ماضی(Flash back) کے طور پر پیش کریں گے تاہم وہ "ماضی" بھی دراصل حال میں وابستہ و پیوستہ چلا آرہا تھا۔

نبوی معاشرہ دین وایمان کی بنیاد پر استوار ہوا تھا۔ اس لیے ایمان، دین اور اہل ایمان کی باہمی وابستگی ایک دوسرے سے برابر بڑھتی رہی۔ یعنی نبوی اسلامی معاشرہ مزید فروغ پاتا رہا، عقیدہ و عمل کے تحت زندگیوں میں تغیرات رونما ہوتے رہے جن کا مشاہدہ خود صاحبان ایمان کے گھر والے کر رہے تھے، مخالفین ومعاندین ایمان واسلام بھی نیا بننے والا نبوی معاشرہ یا ایمان، اسلام کے تحت بننے والے انسانوں کے نئے سانچوں اور نئے ڈھانچوں کو بہ نظر غائر دیکھ رہے تھے اور گھورتے بھی تھے کہ کم از کم ان کی نظر ہی اُنھیں لگ جائے کہ ایمان والوں کی تکلیف اُن کے لیے راحت افزا نہیں ہوسکتی تھی۔ اُن کی اس تمنا کا قرآن نے نوٹس لیا ہے {وَإِن يَكَادُ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ لَيُزۡلِقُونَكَ بِأَبۡصَٰرِهِمۡ لَمَّا سَمِعُواْ ٱلذِّكۡرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُۥ لَمَجۡنُونٞ }[2]

افسوس کہ ان کی تمنائیں حسرت زدہ ہی رہیں۔ نبوی معاشرہ کے اراکین اپنے کردار واخلاق سے جاہلی معاشرہ

1- دیکھیے {وَإِذۡ يَمۡكُرُ بِكَ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ لِيُثۡبِتُوكَ أَوۡ يَقۡتُلُوكَ أَوۡ يُخۡرِجُوكَۚ وَيَمۡكُرُونَ وَيَمۡكُرُ ٱللَّهُۖ وَٱللَّهُ خَيۡرُ ٱلۡمَٰكِرِينَ ٣٠} [سورة الأنفال:30]. (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب کہ منکرین حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تجھے قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلا وطن کر دیں۔ وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چالیں چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔)

2- سورۃ القلم:51(جب یہ کافر لوگ کلام نصیحت (قرآن) سنتے ہیں تو تمہیں ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ گویا تمہارے قدم اکھاڑ دیں گے اور کہتے ہیں کہ یہ ضرور دیوانہ ہے)

کے عوام وخواص کو برابر متاثر کرتے رہے اور آپس میں ایسی شفتگی و محبت سے گزر بسر کرتے رہے کہ حلقہ یاراں میں بریشم کی طرح نرم ونازک بنے رہے لیکن جب رزم حق وباطل کا موقع آیا تو دکھا دیا کہ "فولاد ہے مومن"۔

نبوی معاشرہ کے اس مرحلۂ ارتقاء کا آغاز کوہِ صفا پر اُس خطبۂ رحمۃ للعالمین سے ہوا تھا جو بطور النذیرالمبین آپ نے کفار ومشرکین اہل مکہ کے سامنے ارشاد فرمایا تھا، لیکن اُسی موقع پر خطبۂ جلیلہ سے پہلے جب سید العرب والعجم نے اپنے اخلاق وکردار کے بارے میں مخاطبین سے اپنی سچائی پر گواہی لی تھی تو سب نے بلا استثناء بیک زبان تصدیق کی تھی۔ احقاق حق کے لیے پیغمبر اعظم کو جو سنانا تھا سنا دیا، ببانگ دھل کہہ دیا {فَٱصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ }[1] کی تعمیل کر دی گئی، اُس موقع پر ابو لہب نے (جو آنحضور ﷺ کا سگا چچا تھا)، جن زہریلے الفاظ کے ساتھ رد عمل ظاہر کیا تھا، اس کا وبال خود اسی پر پڑا اور بارگاہِ الٰہی سے فی الفور، اس کے زبان سے نکالے ہوئے زہریلے جملوں کا جواب بھی کڑوے کسیلے الفاظ کے ساتھ نازل ہوا اور اُس بدبخت کو بھی علی الاعلان بتا دیا گیا کہ اسی کے ہاتھ ٹوٹیں گے اور وہ تباہ وبرباد ہو گا اور انجام کار اپنی زہریلی بیوی کے ساتھ لقمۂ جہنم بنے گا۔[2]

خطبۂ کوہِ صفا کے واقعہ نے سب پر سب کچھ آشکارا کر دیا، اب کچھ تکلف باقی نہ بچا تھا۔ حضور سید عالم ﷺ اور آپ کے جانثار، مجسمۂ کردار واخلاق بنے ہوئے بلاڈر اور جھجک کے اظہار ایمان کرنے لگے اور ابلاغ حق کے لیے سینہ سپر ہو گئے یعنی مکی جاہلی معاشرہ میں انقلاب نے دستک دینی شروع کر دی اور اہل ایمان کی تعداد میں اضافہ ناگزیر ہو گیا۔ دارارقم کا تبلیغی مرکز موجب کشش بن گیا۔ عام لوگوں کا تو ذکر ہی کیا، بڑے بڑے صاحبانِ اثر نامور لوگ دارارقم کی چوکھٹ پر آ گئے، یہاں تک کہ حضرت عمر فاروق ؓ جیسے جی دار وطرح دار بھی (جو اپنے گھر سے شمشیر بداماں کسی اور ہی نیت سے نکلتے تھے) دعائے نبوی ﷺ کے زیر اثر (اللهُمَّ أَعِزَّ الْإِسْلَامَ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ خَاصَّةً)[3] شرم وخجالت سے سر جھکائے دارارقم میں آئے تو بلا چوں وچرا دامانِ رسالت سے وابستہ ہو گئے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت عمر کے حلقہ بگوش اسلام ہوتے ہی وابستگان دین وایمان نے (جن کی

1۔ سورۃ الحجر:94

2۔ {تَبَّتۡ يَدَآ أَبِي لَهَبٖ وَتَبَّ ١ مَآ أَغۡنَىٰ عَنۡهُ مَالُهُۥ وَمَا كَسَبَ ٢ سَيَصۡلَىٰ نَارٗا ذَاتَ لَهَبٖ ٣ وَٱمۡرَأَتُهُۥ حَمَّالَةَ ٱلۡحَطَبِ ٤ فِي جِيدِهَا حَبۡلٞ مِّن مَّسَدِۭ ٥} [سورة المسد:1-5].

3۔ **سنن ابن ماجہ**، فَضْلُ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، رقم الحدیث 105۔

اصل تعداد تو اس وقت تک 100 سے کہیں زیادہ ہو چکی تھی لیکن شاید اُس وقت وہاں دارارقم میں 40 کے لگ بھگ حضرات صحابہ موجود تھے اُن کے جذبات اُن لمحات میں متلاطم ہو رہے تھے بالآخر انہوں نے جب) پورے جوش وخروش سے نعرۂ تکبیر بلند کیا تو دشت وجبل گونج اُٹھے۔ پھر یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ حضرت عمر کے حلقہ بگوش اسلام ہونے سے ایسی حوصلہ مندی نے فروغ پایا کہ حرم میں علی الاعلان نماز با جماعت کی ادائیگی ممکن ہو سکی(بلکہ حدیث کے مطابق جب عمر مسلمان ہوئے تو جبریل امین نازل ہوئے، اور یہ فرمایا کہ اے محمد ﷺ تمام اہل آسمان حضرت عمر کے اسلام سے مسرور اور خوش ہوئے۔[1]

پھر دین کی عزت اور اسلام کا ظہور اور غلبہ شروع ہو گیا۔ اور حضور ﷺ نے آپ کا نام فاروق رکھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ حضرت عمر سے تین چار دن پہلے ہی حضرت حمزہ بھی ایمان لے آئے تھے یہ اہل مکہ کے لیے ایک اور بڑا دھچکا تھا جبکہ اس کے برعکس اہل ایمان اور اراکین نبوی معاشرہ میں جوش وجذبہ فزوں تر ہو گیا تھا اور ارتقاء کے لیے ساز گار تھا۔

پہاڑی والے وعظ یعنی خطبۂ کوہِ صفا سے متصل آئندہ 2/3 سالوں میں اگر ایک طرف نبوی معاشرہ توسیع وترقی کی نئی بلندیاں چھونے لگا تو دوسری طرف کفار ومشرکین میں غم وغصے کی لہر دوڑ گئی اور وہ مسلسل ظلم وستم کے نئے حربے آزمانے کے لیے تیار ہو گئے۔ تیسری طرف حالات کی روز افزوں سنگینی دیکھتے ہوئے سید وسرور، حضورانور ﷺ نے ایک نئی حکمت عملی اختیار فرماتے ہوئے اہل ایمان کی ایک جماعت کو ہجرت حبشہ کے لئے اذن واجازت مرحمت فرمادی(چنانچہ اس سلسلے میں پہلی مرتبہ صحابہ وصحابیات میں سے 11 مرد اور 4 عورتوں کا قافلہ 5 نبوی میں عازم حبشہ ہوا تو دوسری مرتبہ اگلے سال 6 نبوی میں 83 مرد اور 18 عورتوں پر مشتمل نسبتاً بڑا قافلہ (کل:116) بلا روک ٹوک حبشہ پہنچ گیا)۔

اصحاب سیر اور مورخین کا خیال ہے کہ آنحضور ﷺ کی طرف سے ہجرت حبشہ کی اجازت شاید اس غرض سے تھی کہ اہل ایمان کو شدائد ومصائب سے کسی حد تک عافیت میسر آجائے اور چاہے تھوڑی مدت کے لیے ہی سہی، انہیں سکون وقرار حاصل ہو تا کہ تعمیل دین وایمان کی مسرت سے آشنا ہوں کیونکہ شاہِ حبشہ کے لیے عدل واحسان سے کام لینے کی شہرت تھی۔[2]

1- ایضا، رقم الحدیث 103۔

2- اکثر مصنفین اپنے بیان میں اور ترتیبِ واقعات میں یہی تاثر پیش کرتے ہیں کہ ہجرت حبشہ دراصل ظلم وستم سے بچنے کے لیے اختیار کی گئی۔ گویا اہل ایمان کی حبشہ آمد پناہ گزینی کے قبل سے تھی۔ مثلاً خود مولانا شبلی کے ہاں ترتیب مضامین یوں ہے: حضرت حمزہ اور حضرت عمر کا اسلام، تعذیب مسلمین، مسلمانوں پر ظلم وستم کے طریقے۔۔۔۔

ہجرت حبشہ کا یہ واقعہ اُس وقت کے حالات میں بہت اہمیت رکھتا تھا۔ اس کے نتیجہ میں جاہلی مکی اشرافیہ کی ناکامی ناقابل برداشت تھی۔ تحریک اسلامی کا فروغ اور نبوی معاشرہ کی توسیعی ترقی نے نئے اُفق تلاش کر لئے تھے۔

1) ہجرت حبشہ کا واقعہ گفتگو اور اہمیت کے حوالہ سے اگرچہ متعدد پہلو رکھتا ہے لیکن یہاں اُن سب باتوں کی تفصیل کا مناسب موقع نہیں۔ تاہم چند حقائق کی نشاندہی ناگزیر ہے، مثلاً اصولی طور پر دعوت نبوی کے نتیجہ میں جاہلی معاشرہ انقلابی تبدیلیوں سے دوچار تھا (جسے ہر فریق محسوس کر رہا تھا)۔ نیز یہ بھی مسلم ہے کہ نبوی مکی معاشرہ ارتقائی منازل طے کر رہا تھا۔ ہجرت حبشہ کوئی اتفاقی امر نہی تھا، نہ کسی مجبوری کا شاخسانہ تھا نہ شدائد ومصائب کے نتیجہ میں کسی پناہ گزین کی طلب تھی۔ اصلاً یہ ایک حکمت عملی تھی جس کے تحت اللہ کی وسیع وعریض سرزمین میں اللہ کی حاکمیت اور رسالت محمدی ﷺ کا ٹھہراؤ اور پھیلاؤ مطلوب تھا۔ نبوی معاشرہ مکہ مکرمہ کے خشک پہاڑوں اور صحراء کی وسعتوں کے بعد سمندر پار براعظم افریقہ میں حبشہ کی فضاؤں میں سمانے جارہا تھا اور اس کی بنیادیں جن ہاتھوں سے رکھوائی جارہی تھیں ان کے پہلو بہ پہلو آثار نبوت ہویدا تھے۔ پھر ذرا اٹھان تو دیکھئے جناب عثمان رضی اللہ عنہ ذوالنورین، بنت رسول ﷺ کا چراغ شخصیت سنبھالے ہوئے تھے، جناب جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے چچیرے بھائی، جناب زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ آپ کے پھپھیرے بھائی، جناب عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ آنحضور ﷺ کے ننھالی رشتہ دار، اور جنابہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا، جنابہ سودہ رضی اللہ عنہا اور جنابہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا جو اُسی سفینہ میں ہمرکاب تھیں اور جو بالآخر امہات المومنین کے شرف

۔۔۔۔بلد کشانِ اسلام، ہجرت حبشہ 5 نبوی۔ پھر مضمون کا آغاز اس طرح فرماتے ہیں: قریش کے ظلم وتعدی کا بادل برس کر نہ کھلا تو رحمت عالم ﷺ نے جانثارانِ اسلام کو ہدایت کی کہ حبش کو ہجرت کر جائیں۔" آگے لکھتے ہیں" جانثارانِ اسلام ہر قسم کی تکلیف جھیل سکتے تھے اور ان کا پیمانۂ صبر لبریز نہیں ہو سکتا تھا لیکن مکہ میں رہ کر فرائض اسلام کا آزادی سے بجالانا ممکن نہ تھا۔ (سیرۃ النبی، ج1، ص229) مولانا کاندھلوی نے ہجرت اولیٰ بجانب حبشہ کے زیر عنوان لکھاہے کہ "اس وقت حضراتِ صحابہ ظاہری اور جسمانی شدائد اور مصائب سے اکتا کر نہیں بلکہ کفر اور شرک کے فتنہ سے گھبرا کر اپنے دین کو ایمان کے رہزنوں کی دست برد سے بچانے کے لیے اللہ کی طرف بھاگے تاکہ اطمینان کے ساتھ اپنے اللہ کا نام لے سکیں۔ (سیرۃ مصطفیٰ، ج1، ص235) جب کہ قاضی سلیمان منصورپوری "رحمۃ للعالمین میں ہجرت حبشہ کے زیر عنوان تحریر فرماتے ہیں۔"جب کفار نے مسلمانوں کو بے حد ستانا شروع کیا تو نبی کریم ﷺ نے صحابہ کو اجازت دی کہ جو کوئی چاہے وہ اپنی جان وایمان کے بچاؤ کے لیے حبش کو چلا جائے۔" ص53

سے مشرف ہوئیں کہ اہل بیت ہونے کا اعزاز بھی اُن ہی مبارک ہستیوں کو حاصل ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ماورائے عرب بھی جو "نبوی معاشرہ" متشکل ہو رہا تھا وہ آنحضور ﷺ کی نسبتوں سے مزین تھا گویا وہ آپ کا اپنا خانوادہ، اپنا گھرانا تھا۔[1]

2) مہاجرین حبشہ کا بہ عافیت وہاں پہنچ جانا اور "زندگی کے مزے لوٹنا" مکی اشرافیہ کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ اس لیے انھوں نے فوری قدم اٹھاتے ہوئے ایک دو رکنی سرکاری وفد (جو حضرت عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ پر مشتمل تھا) شاہِ حبشہ کے دربار میں بھیجا تاکہ وہ وفد بھاری بھرکم تحفوں کی ارزانی اور اپنی چرب زبانی سے کام لیکر مہاجرین کو چارج شیٹ کرے اور بالآخر یہ درخواست / مطالبہ کرے کہ مکہ سے فرار ہو کر یہاں آنے والوں کو واپس بھیجنے کے لیے ان کے حوالہ کیا جائے۔ اس موقع، اور باتوں کے علاوہ شاہِ حبشہ کے استفسار پر قائد مہاجرین جناب جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے جو کچھ برملا کہا اسے چھوٹے بڑے تمام ماخذ میں نقل کیا گیا ہے۔ ہم یہاں مولانا شبلیؒ کی سیرت النبی سے اخذ کر رہے ہیں۔ "ایھا الملک! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایہ کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، قوی لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے۔ اسی اثناء میں ہم میں سے ایک شخص پیدا ہوا جس کی شرافت اور صدق و امانت سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے۔ اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی سے باز آجائیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسائیوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں۔ ہم اُن پر ایمان لائے، شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمال بد سے باز آگئے۔ اس "جرم" پر قوم ہماری جان کی دشمن ہو گئی ہے اور ہم کو مجبور کرتی ہے کہ ہم اس گمراہی میں واپس آجائیں۔[2]

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کا یہ بیان جو بلاخوف و خطر اور بادشاہ، درباریوں، خوشامدیوں، نیز مکی سرکاری وفد کے چالاک وجہاندیدہ ارکان کے سامنے دیا گیا، بجائے خود ثابت کر رہا ہے کہ مکی جاہلی معاشرہ ان دنوں بڑے پیمانے پر تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔ بلکہ خود بیان کرنے والا قائد مہاجرین اپنے ساتھیوں سمیت ان تبدیلیوں سے گزر کر آرہا تھا۔ ان کی زندگیاں حسن اخلاق و کردار سے جس حد تک سنور گئی

1- مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: ابن ھشام، السیرۃ النبویہ، مصطفےٰ البابی، 1936ء، ج2، ص3 تا 10۔
2- شبلی نعمانی، **سیرت النبی ﷺ**، ادارہ اسلامیات، لاہور، ستمبر 2002ء، ج1، ص63۔262۔

تھیں اس کا ایک اور ثبوت حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے اپنے تخاطب کے دوران مکی سرکاری وفد سے بواسطۂ شاہی جو سوالات دریافت کیے وہ بجائے خود انقلاب معاشرہ کی نوید اور تبدیلئ معاشرہ کے ثبوت تھے۔[1]

3) نبوی مکی معاشرہ میں ارتقاء کا عمل ہمہ جہت، پہلے سے جاری وساری اور دن بہ دن اپنے اثرات نمایاں کر رہا تھا ساتھ ہی ساتھ ہر سال اس میں عالمی آہنگ اور بین الاقوامی رنگ اُس دعوت وارشاد کے نتیجہ میں پیدا ہوتا جارہا تھا جو مواسم حج وعمرہ میں بیت اللہ کی زیارت کے لیے آنے والے دنیا بھر کے حجاج وزائرین کے سامنے آنحضور ﷺ، ان کے خیموں، قیام گاہوں اور اجتماعات تک رسائی حاصل کر کے پہنچا رہے تھے۔ اس کا سب سے بڑا اثر یہ تھا کہ پوری دنیا میں ایمان واسلام کا چرچا پھیل گیا تھا۔ لیکن ہجرت حبشہ کے واقعات نے یکایک غیر معمولی اثرات مرتب کئے۔ نبوی معاشرہ گویا ایک ہی جست میں ارتقاء کی کئی منزلیں عبور کر گیا۔ حبشہ سمندر ریچ براعظم افریقہ میں واقع مشرقی رومی سلطنت کے اقتدار کا نمائندہ، شاہِ حبشہ نجاشی کے زیر حکمرانی ایک ایسا مشہور خطہ تھا جہاں امن وامان کا دور دورہ تھا اور معاشی معاشرتی خوشحالی خیمہ زن تھی۔ مہاجرین حبشہ بھی وہاں پہنچے کہ آسودہ حال تھے۔ ان کی مدد واعانت کے لئے شاہی فرمان کا اجراء کیا جا چکا تھا اور یہ تنبیہ جاری کر دی گئی تھی کہ باشند گان حبشہ کی طرف سے مہاجرین کے ساتھ کسی نازیبا حرکت اور ظلم وتعدی میں سزا و جرمانہ کیا جائے گا۔ مہاجرین

1- حضرت جعفر طیار نے پہلا سوال مکی وفد کے اراکین سے بواسطہ نجاشی یہ کیا کہ کیا ہم کسی کے غلام ہیں جو اپنے آقاؤں سے بھاگ کر آئے ہیں؟ نجاشی نے عمرو بن العاص سے پوچھا بتاؤ یہ لوگ کیا کسی کے غلام ہیں؟ عمرو بن العاص نے جواب دیا: **لا بل احرارکرام** (غلام نہیں بلکہ آزاد اور شریف ہیں) حضرت جعفر کا دوسرا سوال تھا کہ "کیا ہم کسی کا خون کر کے آئے ہیں؟ نجاشی نے یہی سوال عمرو بن العاص کے سامنے دہرایا۔ عمرو بن العاص نے صاف صاف کہہ دیا: **لا قطرۃ من دم** (انہوں نے ایک قطرہ تک خون نہیں بہایا) حضرت جعفر کا تیسرا سوال تھا۔ کیا ہم کسی کا کچھ مال لیکر بھاگے ہیں تو ہم اس کو ادا کرنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ (وفد کا جواب تھا: **ولا قیراط**) یہ لوگ تو کسی کا ایک قیراط بھی لیکر نہیں آئے۔ نجاشی نے وفد قریش سے کہا کہ پھر کس چیز کا مطالبہ ہے؟ جناب عمرو بن العاص نے کہا "ہم اور یہ پہلے ایک دین پر تھے ہم اس دین پر قائم رہے اور ان لوگوں نے اُس کو چھوڑ کر ایک نیا دین اختیار کر لیا ہے۔ نجاشی نے صحابہ سے مخاطب ہو کر کہا جس دین کو تم نے چھوڑا ہے اور جس دین کو تم نے اختیار کیا ہے وہ کیا دین ہے۔ (الاصبہانی، اسماعیل بن محمد، ابو القاسم، دلائل النبوۃ، دار طیبہ، ریاض، ط اولیٰ 1409ھ، ص100-101)۔ یہی تفصیلات نہ صرف نجاشی کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کا باعث بنیں، یہ تفصیلات اس بات پر بھی دلالت کرتی ہیں کہ مکی جاہلی معاشرہ تبدیلیوں سے مسلسل گزر رہا تھا۔ اور نبوی معاشرہ... ارتقاء کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ مزید برآں مکی اشرافیہ کی ضدہٹ دھرمی، بدنیتی اور ظلم وتعدی کا نقشہ بھی سب کے سامنے آگیا۔

صحابہ وصحابیات کی یہ قدر ومنزلت، نہ صرف یہ کہ بود وباش میں سہولت وطمانیت کا باعث تھی بلکہ دعوت دین اور معاشرت ایمانی میں فروغ کا باعث تھی۔ کیونکہ تعمیل دین میں وہ آزاد تھے۔ مولانا شبلیؒ نے لکھا ہے کہ اس ہجرت سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ جو شخص اسلام لے کر جہاں جاتا وہاں اسلام کی شعائیں خود بخود پھیلتی تھیں۔[1]

4) اب گویا نبوی معاشرہ (کی تعمیر وارتقاء کا معاملہ) صرف مکہ مکرمہ، اس کے مضافات اور دیگر علاقہ جات عرب تک ہی محدود نہ رہا تھا بلکہ اس کا عالمی / بین الاقوامی چہرہ بلکہ روئے تاباں نمایاں ہو کر دنیا کے سامنے آ گیا۔ اس کا یہ اظہار یہ (exposure) خود اس معاشرہ کے باطن میں مضمر تھا کیونکہ نبوی معاشرہ کلمۂ توحید اور دین وایمان کی ان بنیادوں پر استوار تھا جن کے سبب بالقوہ اس معاشرہ میں عالمی وسعتوں تک پھیل جانے کی صلاحیت اور امکانی اہلیت (potential) بارآور ہو چکی تھی اور ہر فرد بشر کو بلا کسی تعصب کے اپنے طریقۂ جذب وانجذاب سے اپنے دامن میں چھپا لینے کی صلاحیت موجود تھی۔ ہجرت حبشہ اور اس سے متعلقہ واقعات کا بین الاقوامی نقطۂ نظر سے ایک پہلو یہ بھی قابل ذکر ہے کہ یہ قریش کی بین الاقوامی / خارجی محاذ پر ذلت آمیز شکست کا باعث ہوئی کہ ان کا بھیجا گیا سرکاری وفد ناکام ونامراد واپس آیا، تحفہ تحائف کی رشوت کام نہ آئی اور درباریوں کی خوشامد درآمد بے سود رہی اور ان کا موقف کسی سطح پر پذیرائی حاصل نہ کر سکا۔ جبکہ اس کے بالمقابل آنحضرت ﷺ کی حکمت عملی کامیاب ہوئی اور آپ کی یہ گویا پہلی سیاسی خارجی فتح تھی جس نے مکی جاہلی اشرافیہ کو بے ننگ ونام کر دیا۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ہجرت حبشہ میں اگر ایک طرف مہاجر صحابہ وصحابیات کو امن وعافیت نصیب ہوئی اور ان کے لئے اپنے دین پر قائم رہنے کا موقع ملا تو دوسری طرف خود اہل حبشہ دین توحید سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ بلکہ جب یہاں کی خبریں عیسائیت کے نجرائی مرکز تک پہنچیں تو ان کا ایک وفد جو 10 یا 20 افراد پر مشتمل تھا مکہ مکرمہ میں آنحضور ﷺ کی خدمت میں پہنچا اور ایمان لایا[2]۔

1- سیرت النبی ﷺ، ج 1، ص 160۔

2- دیکھئے: ابن ھشام ج 2، ص 32، عنوان ہے: امر وفد الانصاری الذین اسلموا، پھر لکھا ہے کہ مکہ مکرمہ میں آنحضور ﷺ کے پاس نصاریٰ کے 20 افراد یا اس کے قریب آئے "جب کہ انہیں حبشہ سے خبریں ملی تھیں (حِينَ بَلَغَهُمْ خَبَرُهُ مِنْ الْحَبَشَةِ) پھر وہ مسجد حرام میں ان کے پاس بیٹھے، گفتگو کی سوالات وجوابات کے بعد حضور ﷺ نے انہیں دعوت دی پھر ان کے سامنے چند آیات قرآنی کی تلاوت کی تو ان پر رقت طاری ہو گئی۔۔۔

نبوی معاشرہ کا ارتقاء:(4)

مکی جاہلی معاشرہ دن بہ دن تبدیل ہو رہا تھا اور نوزائیدہ نبوی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل اور بتدریج ارتقاء جاری و ساری تھا۔ ہمہ گیر تبدیلی کا یہ منظر مختلف عوامل کا نتیجہ تھا۔ سب سے بڑھ کر تو اس کا سبب حضور نبی کریم ﷺ کی بے نظیر شخصیت اور آپ کی قیادت باسعادت ورحمت تھی۔ خَلق و خُلق کی تمام خوبیوں کے ساتھ آپ خُلق عظیم کے مرتبہ پر فائز تھے۔ آپ کا ہر عمل وحی کے تابع تھا، پھر الہامی ہدایت، نزول قرآن اور جبریل امین کی وساطت سے رہنمائی کا تسلسل قائم ودائم تھا۔ فرائض منصبی (تلاوت آیات، تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس)[1] کی ادائیگی ہمہ جہت، ہمہ وقت تھی۔ معمول کے مطابق طریقۂ کار یہ تھا کہ جب بھی قرآن کا بصورت وحی نزول ہوتا تو آپ ﷺ تلاوت فرما کر اسے دوسروں تک[2] پہنچا دیتے۔ آیات ربانی کا داخلی حسن، پھر دہن مبارک سے حسن تلاوت کی آبشار، پھر آواز واندازِ رحمۃ للعالمین، سامعتوں کو متحیر ومسخر کرنے کے لیے کافی ہوتی تھی جو سنتا اپنا دل دے بیٹھتا۔ اس کی مثالیں بے شمار، اور تو اور بدترین مخالفین اور دشمنانِ دین (ابوجہل، ابوسفیان، اخنس بن شریق وغیرہ) نہ چاہنے کے باوجود سنتے، دوسروں سے چھپ کر سنتے تو بے خود ہو جاتے۔ اسی لیے دعوت دین کی مخالفت میں پہلی کوشش یہ گردانتے کہ قرآن کی آواز کہیں کانوں میں نہ پڑنے پائے۔ اس سلسلہ میں ان کی منفی حکمت عملی یہ ہوتی کہ تلاوت قرآن کے وقت زیادہ سے زیادہ شور وغل مچایا جائے۔ قرآن میں اُن کی اس حرکت کا نوٹس لیا گیا ہے {وَقَالَ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ لَا تَسۡمَعُواْ لِهَٰذَا ٱلۡقُرۡءَانِ وَٱلۡغَوۡاْ فِيهِ لَعَلَّكُمۡ تَغۡلِبُونَ ﴿٢٦﴾}[3] ان سب کے باوجود قرآن کی اثر آفرینی ناقابل بیان، ہر رکاوٹ سے ماوراء تھی۔ جناب طفیل دوسی رضی اللہ عنہ جو کانوں میں روئی ٹھونس کر

۔۔۔ختم تلاوت پر انہوں نے کلمہ پڑھا اور ایمان لے آئے۔ حرم میں قریش مکہ بیٹھے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ وفد نصاریٰ چلنے لگا تو کفار قریش نے پوچھ گچھ کی اور ابوجہل نے طنز وتشنیع کی بوچھاڑ کر دی اور ایمان لانے پر مطعون کیا لیکن انہوں نے الجھنا پسند نہیں کیا اور کفار سے معذرت کر کے چلے گئے کہ ہم جاہلوں سے نہیں الجھتے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے ایضاً)

1- دیکھئے: سورۃ البقرۃ:129 / سورۃ الجمعہ:2

2- بروایت جابر، ابن اسحاق میں ہے کہ "جب رسول اللہ ﷺ پر قرآن کا نزول ہوتا تو آپ پہلے اسے مردوں کے سامنے تلاوت فرماتے اور پھر عورتوں کے سامنے۔ اس طرح گویا تبلیغ واشاعت میں دونوں اصناف (مرد وعورت) کو برابر کی اہمیت دی گئی۔ (ابن اسحاق بن یسار، کتاب السیر والمغازی، دار الفکر، بیروت، ط اولیٰ 1978ء، ص147۔)

3- دیکھئے: سورۃ حم السجدہ:25

پھرتے تھے کہ کان میں آواز نہ آجائے لیکن آواز کیا، لب ہائے نبوی ﷺ کے نشیب و فراز عکس تلاوت کے موید تھے پھر آواز بھی بہ اشتیاق مزید سننی پڑی، آخر دل بے قابو ہو گیا ساحل ایمان تک پہنچ کر ہی دم لیا۔ پھر جب اپنے دل کی بستی بسا کر رہنے کی بستی لوٹے تو خود مبلغ دین و ایمان بن چکے تھے یہ تسخیر لمحوں کی بات تھی۔ ایسے "متاثرین" کی مثالیں بے شمار ہیں، یہاں مزید گنجائش نہیں۔ نہ صرف یہ کہ اعتقادی طور پر بے شمار لوگوں نے قرآن کا اثر تاثیر کشش ملاحظہ کی، بلکہ اس کا اجتماعی مظاہرہ خود اہل مکہ نے رمضان 5 نبوی میں بہ چشم خود دیکھا ہے۔[(1)] حضور نبی کریم ﷺ نے کفار و مشرکین کے بھرے مجمع میں سورۃ النجم کی تلاوت فرمائی اور سورہ کے آخر میں آیت سجدہ آنے پر آپ نے سجدہ فرمایا تو سب کے سب جو اس مجمع میں موجود تھے سجدہ ریز ہو گئے۔ ولید بن مغیرہ اور احیحہ بن عاص جو بہت بوڑھے تھے اور سجدہ نہ کر سکتے تھے انہوں نے زمین سے مٹی اٹھا کر اپنی پیشانی پر لگائی کہ ہمارے لیے یہی کافی ہے۔ بعد میں کفار خود حیران و پریشان ہوئے اور مختلف تاویلیں کرنے لگے۔ قرآن سن کر کفار و مشرکین کی یہ سجدہ ریزی حبشہ میں نہ معلوم کیسے ان کے اسلام لانے کی افواہ بن گئی جس کی بناء پر ہجرت حبشہ اوّل میں جانے والوں میں سے 4/5 حضرات نے رجوع فرمایا۔ پھر

1- تاثیر قرآن کا اجتماعی مظاہرہ اہل مکہ نے رمضان 5 نبوی میں اس وقت دیکھا جب کہ آنحضرت ﷺ نے سورۃ النجم پورے مجمع کے سامنے تلاوت فرمائی۔ اس وقت حرم میں کافر اور مومن سب موجود تھے۔ جب سورۃ النجم کی آخری آیت...62 کی تلاوت فرماتے ہوئے آیت سجدہ پر پہنچے تو آپ نے سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ مسلم و کافر سب سجدہ میں گر گئے۔ بقول مولانا مودودی "اس کلام کی شدت تاثیر کا حال یہ تھا کہ جب آپ ﷺ نے سنانا شروع کیا تو مخالفین کو اس پر شور مچانے کا ہوش ہی نہ رہا اور خاتمہ پر جب آپ ﷺ نے سجدہ فرمایا تو وہ بھی سجدے میں گر گئے بعد میں انہیں سخت پشیمانی ہوئی کہ یہ ہم سے کیا کمزوری سرزد ہو گئی۔ (دیکھئے مولانا مودودی، تفہیم القرآن، ج5، ص188 تا224، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور جدید ایڈیشن 2009ء) مولانا نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ بات قریب قریب یقینی طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ سورۃ رمضان 5 نبوی میں نازل ہوئی ہے۔ (ایضاً ص 189) ابن سعد کا بیان ہے کہ اس سے پہلے رجب 5 نبوی میں صحابہ کی ایک مختصر سی جماعت حبش کی طرف ہجرت کر چکی تھی پھر جب اسی سال رمضان المبارک میں یہ واقعہ پیش آیا کہ رسول اللہ ﷺ نے قریش کے مجمع عام کے سامنے سورۂ نجم کی تلاوت فرمائی اور کافر و مومن سب آپ کے ساتھ سجدے میں گر گئے تو حبش کے مہاجرین تک یہ قصہ اس شکل میں پہنچا کہ کفار مکہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ اس خبر کو سن کر کچھ لوگ شوال 5 نبوی میں مکہ واپس آ گئے۔ مگر یہاں آ کر معلوم ہوا کہ ظلم کی چکی اسی طرح چل رہی ہے جس طرح پہلے چل رہی تھی آخر کار دوسری ہجرت حبشہ واقع ہوئی۔ {ابن سعد، الطبقات الکبری، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ط اولیٰ 1990ء، ج1 ص160} مولانا شبلیؒ نے سیرۃ النبی میں سورۃ النجم اور اس کے متعلقات پر بحث کی ہے۔ (دیکھئے ج1، ص237 مابعد)

دوسری ہجرت حبشہ واقع ہوئی۔

آپ ﷺ کی تعلیم، تبلیغ اور تربیت سے مستفاد ہر شخص، ہر مرد وزن، ہر رکن معاشرہ، ہر صاحب دین وایمان بجائے خود مبلغ اور داعی کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ ہر آن خلوص نیت کے ساتھ تعلیم و تبلیغ کے لیے تیار رہتا تھا، ہر لحظہ رضائے الٰہی کا متمنی، ہر گام ہمت وشجاعت، صبر و تحمل سے آراستہ، خوبیٔ کردار سے وابستہ، ہر وقت پیشقدمی کے لیے پر عزم، رواں دواں رہتا تھا۔ اس کی دین کی خاطر ہونے والی جدوجہد لا محدود تھی۔ آنحضور ﷺ کا فرمودہ ایک پورا نظام تعلیم وتربیت اور طریقۂ تبلیغ، وعظ ونصیحت تھا[1] جو نبوی مکی معاشرہ میں جاری وساری تھا تاکہ منزل بہ منزل فلاح وکامرانی حاصل ہوتی جائے۔ عبادات اور تعلق باللہ کی تمام صورتیں ان کی جسمانی وروحانی توانائی کا ذریعہ اور از دیاد خلوص وللّٰہیت کا باعث تھیں۔ ان کی اصل منزل تھی دنیا وآخرت کی فلاح، وہ ہمہ وقت اسی طلب میں سرگرداں اور اسی کے نشہ میں سرشار رہتے تھے۔ حکم بھی یہی

1- نبوی مکی معاشرہ کی اصل بنیاد، نظری فکری تعلیم، عقائد دین وایمان کی پختگی پر استوار تھی اور مدعا یہ تھا کا اللہ کا فرمانروا، تابعدار بندہ، علم و اخلاق کی تمام خوبیوں (إِنَّ مِنْ أَحَبِّكُمْ إِلَيَّ أَحْسَنَكُمْ أَخْلَاقًا:بخاری3759: ومسلم2321:) کے ساتھ پروان چڑھے۔ اس کا ہر کام خلوص نیت کا آئینہ (إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ :بخاری01: ومسلم1907) نمائش ریاکاری، شہرت و دکھاوے سے دور ہو۔ رحمدلی، نرمی، مہربانی، شفقت، دوسروں کے لیے خیر خواہی کا عادی(لَا يَرْحَمُ اللهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ: بخاری7376: ومسلم2319)(مَنْ يُحرَمِ الرِّفقَ يُحرَم الخيرَ كلَّه: مسلم2592:) خصائل ایمان میں سے لازمی حصہ جو انفرادی اجتماعی ہر انصاف کا پہلو محرک اور بنیاد ہے (لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ:بخاری13: ومسلم45:) ظلم کی ہر سطح ہر قیمت پر مذمت (الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ :بخاری2447: ومسلم2578:) شرط ایمان یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ہاتھ وزبان سے محفوظ رہے(الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِن لِّسَانِهِ وَيَدِهِ: بخاری10: ومسلم41:) وہ شخص جنت میں نہیں جاسکتا جس کا پڑوسی اس کی ایذاء رسانی سے محفوظ نہ ہو(لا يَدْخُلُ الجَنَّةَ مَنْ لاَ يَأمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ: مسلم46:)۔ جھوٹ کی سخت مخالفت (كَفَى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ: مسلم4:) مسلمان کے مسلمان پر پانچ حقوق، سلام کا جواب، مریض کی بیمار پرسی، جنازے کے ساتھ مشایعت، دعوت قبول کرنا اور چھینک کا جواب دینا(بخاری:6222)(لاَ تَقَاطَعُوا وَلاَ تَدَابَرُوا وَلاَ تَبَاغَضُوا وَلاَ تَحَاسَدُوا وَكُونُوا عِبَادَ اللَّهِ إِخْوانًا :بخاری6064: ومسلم30:) سماجی انصاف کی ناقدری انہی باتوں سے ہوتی ہے۔ یہ وہ اصول ہدایات اور ضابطۂ عمل تھا علمی فکری، علمی اخلاقی سطح پر نبوی مکی معاشرہ میں جاری وساری رہا البتہ اس وقت کسی اقتدار، حکومت اور قوت نافذہ کی کمی اور عدم موجودگی کو توسیع معاشرہ کے اگلے مراحل میں پورا کیا جا سکتا تھا۔

تھا{يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱصۡبِرُواْ وَصَابِرُواْ وَرَابِطُواْ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُونَ ﴿٢٠٠﴾} (1)

تغیر حالات و وقائع کا ایک اور سبب جو بظاہر منفی تھا اور معاندین و مخالفین کی جانب سے کئے جانے والے ظالمانہ اقدامات پر مشتمل تھا۔ لیکن ان کے اثرات اہل ایمان کے حق میں مثبت ثابت ہوتے رہے یعنی کفار و مشرکین جتنا اسلام کو دباتے تھے، اپنی فطرت میں لچک کے باعث وہ اتنا ہی ابھرتا تھا۔ یہ کشمکش کئی سالوں سے جاری وساری تھی اور اس وقت تک مکی جاہلی معاشرہ کے ارباب اثر کے مسلسل منفی اقدامات، نبوی معاشرہ کی پے در پے کامیابیوں کا باعث بن رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مکی اشرافیہ مسلسل "ہزیمت" سے دوچار تھی اس لیے محرم 7 نبوی میں انھوں نے جواباً ضروری سمجھا کہ "عزیمت" کا راستہ اختیار کرتے ہوئے قبائلیت اور عصبیت جاہلیہ سے کام لیتے ہوئے، آنحضرت ﷺ کے محافظ و سرپرست خاندانوں، بنو ھاشم اور بنو المطلب کا غیر معینہ مدت کے لیے معاشی اور سماجی بائیکاٹ کر کے، نہ صرف یہ کہ ان کی زندگی کو مشکل ترین حالات سے دوچار کر کے معاشی اور سماجی سطح پر مفلوج کر دیا جائے بلکہ اس طرح مصائب و شدائد کی ایسی سنگینی اُن خاندانوں پر مسلط کر دی جائے کہ وہ خود اپنی جان چھڑانے کے لیے، اپنے منظور نظر کو قتل کے لیے خود ہی پیش کر دیں (گویا سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے)۔ اس غرض سے امراء قبائل کے اشتراک سے انھوں نے خاندان بنی ہاشم اور بنو عبد المطلب کے معاشی اور سماجی مقاطعہ کا خطرناک فیصلہ کر ڈالا اور باقاعدہ طور پر منصور بن مکرمہ کے ہاتھوں ایک مہ نامہ لکھوا کر خانۂ کعبہ کے دروازہ پر آویزاں کر دیا تاکہ دور و قریب سب کو معلوم ہو جائے کہ وہ سب اس کی پاسداری کریں اور سفاکانہ عمل کو تقویت پہنچائیں۔

خاندان بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کے معاشی سماجی بائیکاٹ کا فیصلہ غالباً تاریخ مکہ ہی کیا تاریخ عرب میں ایک منفرد و نایاب فیصلہ تھا، جو واقعتاً اُن خاندانوں کی بقا اور زندگی کے لیے چیلنج تھا، اس سے بیک وقت کئی فوائد حاصل ہو سکتے تھے۔ ایک تو یہی کہ اُن خاندانوں کو اپنے کئے کی سزا مل جائے گی کہ مکی جاہلی معاشرہ کے نزدیک نئے دین کا فتنہ کھڑا کرنے والے کی سرپرستی کر کے اپنے آباؤ اجداد کے متداول دین کی بے توقیری کا سبب بنے، دوسرے یہ کہ معاشی اور سماجی بائیکاٹ کا مطلب تھا کہ خاندانوں کا جینا دو بھر کر دیا جائے کہ معاشی وسائل کی کمیابی اور سماجی تعلقات سے محرومی، خاندان کے ہر فرد و بشر، مرد و خواتین، بوڑھے جوان کو زندگی کی گوناگوں ضرورتوں اور سماجی انصاف کی مسرتوں سے محروم کر دیں گے۔ تیسرے یہ کہ بااثر قبائل کا متفقہ

1- سورۃ آل عمران:200

فیصلہ ان خاندانوں کی مزاحمت سے بدلا نہیں جاسکے گا اور چوتھا سب سے بڑا فائدہ یہ کہ بائیکاٹ کے نتیجہ میں مصائب وشدائد کا ناقابل برداشت اثر یہ ہو گا کہ وہ حضرت ابو طالب کے بھتیجے کو حوالے کرنے پر بہ آسانی آمادہ ہو جائیں گے کیونکہ اُن کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ لَا يُجَالِسُوهُمْ وَلَا يُبَايِعُوهُمْ وَلَا يَدْخُلُوا بُيُوتَهُمْ حَتَّى يُسْلِمُوا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلْقَتْلِ[1] یہ سب سوچنے کی باتیں ہیں ورنہ اصلاً وہ اتنے سنگدل اور اذیت پسند تھے کہ وہ اُن لوگوں کو خود موت سے مرتا دیکھنا چاہتے تھے، بھوک پیاس سے بے تاب بچوں کے رونے بلکنے کی آوازیں سننا چاہتے تھے اُن کی آرزو تھی کہ اپنے کئے کی سزا وہ خود بھگتیں۔ یہ اُن ظالموں کی آرزوئیں اور تمنائیں، ان کا انسانیت دشمن فیصلہ تھا جسے روبہ عمل لانے کے لیے نگرانی کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔

یہ ان کافروں ظالموں کے فیصلے تھے لیکن قضاوقدر کے فیصلے کچھ اور تھے۔ خاندان بنو ہاشم اور بنوعبد المطلب کے کارپردازوں نے بھی اپنے آدمی کی حفاظت کے لیے ڈٹ جانے کا فیصلہ کیا اور جواباً قبائلی عصبیت کا بے مثال مظاہرہ کرتے ہوئے، خونخوار بااثر قبائل کی یہ فرمائش پوری کرنے سے انکار کر دیا۔[2]

1- بنیادی و ثانوی مآخذ میں مقاطعہ کی دستاویز/عہد نامہ کے الفاظ معمولی ردو بدل سے لکھے گئے ہیں۔مثلاً(لاَ يُنَاكِحُوهُمْ وَلاَيُبَايِعُوهُمْ، حَتَّى يُسْلِمُوا إِلَيْهِمُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) گویااس میں معاشرتی اور معاشی مقاطعہ شامل ہو گیا لیکن ابن کثیر کے ہاں دوسری تفصیلات بھی مذکور ہیں۔مثلاً ایک جگہ لکھا ہے کہ(اجْتَمَعَ الْمُشْرِكُونَ مِنْ قُرَيْشٍ، فَأَجْمَعُوا أَمرهم أَن لا يُجَالِسُوهُمْ وَلَا يُبَايِعُوهُمْ وَلَا يَدْخُلُوا بُيُوتَهُمْ حَتَّى يُسَلِّمُوا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلْقَتْلِ، وَكَتَبُوا فِي مَكْرِهِمْ صَحِيفَةً وَعُهُودًا وَمَوَاثِيقَ: لَا يقبلُوا من بني هَاشم صلحا أبدا، وَلَا تَأْخُذُهُمْ بِهِمْ رَأْفَةٌ حَتَّى يُسْلِمُوهُ لِلْقَتْلِ.)ملاحظہ ہو: السیرۃ النبویۃ،ابن کثیر م:774،دار احیاء التراث العربی،بیروت،ج2،ص44۔

2- جناب ابو طالب کا مؤقف صاف اور واضح تھا کہ وہ اپنے عزیز ترین بھتیجے کو بچاتے ہوئے مر جائیں گے مگر قتل کے لیے کبھی پیش نہ کریں گے "فو الله لَا نسلمه أبدا حَتَّى يَمُوت من عندنَا آخِرنَا. "(ابن کثیر،ج2،ص 45)انہوں نے اپنے مخالفین و معاندین پر یہ واضح کر دیا کہ وہ یہ بائیکاٹ بلاجواز محض ہٹ دھرمی سے کر رہے ہیں اور خود ہی ظالم ہیں اور قاطع رحم ہیں۔(یامعشر قريش علام نحصرونحبس وقدبان الأمر وتبين أنكم أولى بالظلم والقطيعة والإساءة)"{صالحی شامی، محمد بن یوسف، سبل الہدی والرشاد، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1993ء،ج2ص379۔} اسی موقع پر آپ نے وہ قصیدہ لکھا جو بہت مشہور ہے اور اس میں اس عزم بالجزم کا اظہار کیا کہ وہ کسی قیمت پر حضور صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْہِ وَسَلَّم کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے نہ ہم اپنا گھر بار چھوڑ کر مکہ سے کہیں اور جائیں گے۔"(كَذَبْتُمْ وَبَيْتِ اللَّهِ نَتْرُكُ مَكَّةَ وَنَظْعَنُ إِلَّا أَمْرُكُمْ فِي بَلَابِلِ)"انہوں نے بہادری سے کہا کہ ہم اس

جناب ابو طالب نے اپنے سارے طرفداروں اور حمایتیوں کو مرغی کی طرح سمیٹ کر اپنے محلے شعب ابی طالب کے پروں میں چھپالیااور گویاخود محصور ہوگئے۔ پھر غیر معمولی طور پر طاری کئے جانے والے معاشی اور معاشرتی مقاطعہ کی تمام ترسختیوں کو جھیلتے ہوئے پوری شجاعت اور بہادری سے، صبر سکوں، تحمل، برداشت اور توکل وقناعت کے ساتھ تین سال کی طویل مدت تک کا براوقت بھی اتنے اچھے طریقہ سے گذار دیا کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے پھر اُن کے اولوالعزم بھتیجے، اور باوفامتاثرین نے ہمت وحوصلہ اور صبر و تحمل کی لازوال مثالیں قائم کردیں۔ اِدھر آنحضور ﷺ کی جانب سے نہ اپنے فرائض منصبی سے غفلت برتی گئی اور نہ نوزائیدہ معاشرہ کی توسیع وترقی سے صرف نظر کیا گیا۔ 7 نبوی تا10 نبوی کی تین سالہ مدت، غیر معمولی حالات، دنیا جہاں کی نظریں اور اصل مقاصد میں ناکامی نے شاید خود اُن کافروں کو تھکادیا ہو گا۔ پھر ان کے اپنے لوگوں میں سے کچھ خود دار وعزت مند افراد (ابوالبختری، ہشام العامری، زمعہ بن اسود اور مطعم بن عدی وغیرہ) نے اس صورت حال کے تسلسل کو مزید گوارا نہیں کیااور خانۂ کعبہ جاکر بچے کھچے عہد نامہ کو نوچ کر تار تار کرڈالا۔
اس پر تائید غیبی کا مظاہرہ سب نے دیکھا کہ دیمک نے معاہدہ کے تمام الفاظ کو بجز اسم الٰہی، کھا کر صاف کر ڈالا تھا۔ یوں وہ سفاکانہ معاہدہ اپنی موت آپ مر گیااور کفار ومشرکین کی قیادت کو ذلت وبدنامی کے سوا کچھ نہ دے سکا۔[(1)]

مقاطعہ کی سہ سالہ مدت اپنے نتائج و ثمرات میں ہر فریق کو بہت کچھ سبق دے گئی۔ مکی جاہلی اشرافیہ نے دیکھ لیا کہ جناب ابو طالب نے عصبیت جاہلیہ کے معیار پر بھی کمال شجاعت سے اپنے بھتیجے کی حفاظت کا فریضہ انجام دیااور کفار قریش کی مجموعی قوت اپنی بہترین منصوبہ بندی کے باوجود ناکام ونامراد ٹھہری۔ ان کے نزدیک یہ امر بھی حیرت انگیز تھا کہ آنحضور ﷺ اور ان کے متبعین نے یہ تمام عرصہ وسائل نہ ہونے کے باوجود محض صبر، برداشت، تحمل وتوکل سے گزار دیا اور کوئی حرف شکایت زبان پر نہ لائے۔ یہ کمال تربیت کی دلیل تھی کہ ضروریات اور خواہشات کو ایک حد کے اندر رکھا جائے۔ سورۃ التکاثر سے وہ دنیا کی بے رغبتی کا سبق اور سورۃ العصر سے "وقت" کی اہمیت جان چکے تھے اور دنیا اور آخرت دونوں میں فلاح اور خسران میں "صبر" کا مقام ومرتبہ اُن پر واضح ہو چکا تھا اور بحیثیت مجموعی بااثر مکی قبائل نے سمجھ

۔۔۔وقت چھوڑ کر جانے والے نہیں جب تک کہ امن کے دشمنوں کو اپنے نیزوں سے گھائل نہ کرلیں۔ نیز کہا ہم ان کو حوالے کرنے والے نہیں جب تک ہماری لاشیں اور اپنی بیوی بچوں کو نہ بھول جائیں۔ (ایضا، ج2ص380)

1- اس کی تفصیلات تمام مآخذ میں ہیں مثلاً ابن ھشام ج2، ص14 تا 21، ابن سعد ج1، 208 تا280، وغیرہ

لیا تھا کہ جب تک جناب ابو طالب موجود ہیں معاندین و مخالفین اُن کے بھتیجے محمد بن عبد اللہ (صل اللہ علیہ وسلم) کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔

نبوی (مکی) معاشرہ کا ارتقاء: (5)

شعب ابی طالب میں محصوری اور شدائد و مصائب کا معروف زمانہ محرم 7 تا 10 نبوی تین سال کا ہے۔ لیکن اس کے متعلقات ذرا سے کچھ پہلے اور کچھ بعد کے واقعات سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ مثلاً ہجرت حبشہ اول و ثانی کے اثرات مابعد، یا مثلاً شعب ابی طالب سے نکلتے ہی آپ کے محبوب چچا اور حمایتی جناب ابو طالب کا انتقال ہو گیا۔ یہ ایک جانب مکہ مکرمہ اور خاندان بنو ہاشم، بنو عبد المطلب اور دوسرے متعلقین کے لیے ایک بڑا سانحہ تھا تو دوسری طرف خود نبی محتشم ﷺ کی ذاتی زندگی کے تحفظ کے باب میں بڑا نقصان تھا۔ کفار و مشرکین کی گویا تمنا بھر آئی، وہ مقاطعہ کے دوران اپنی ناکامیاں دیکھ چکے تھے اور اندازہ کر چکے تھے کہ نبوی ﷺ معاشرہ کے ارتقاء کو بس ایک حد تک محدود کرنے کے علاوہ وہ کچھ نہیں کر سکے۔ کیونکہ بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کے علاوہ اہل ایمان کی بڑی تعداد دوسرے خاندانوں سے تعلق رکھتی تھی جو مقاطعہ سے باہر تھے (اگرچہ بعض دوسرے خاندانوں کے اہل ایمان کی غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ حضور سید عالم ﷺ اور دوسرے مسلم و غیر مسلم عناصر تو شدائد و مصائب سے نبرد آزما ہوں اور وہ خود آسائشوں سے متمتع ہوں اس لیے وہ بھی اٹھ کر شعب ابی طالب کے حصار میں آگئے) پھر شہر حرم میں متاثرین کو معمولی راحت رسانی بھی کفار و مشرکین کے لیے موجب تکلیف تھی۔ علاوہ ازیں انہیں اس پر بھی افسوس تھا کہ ابو طالب کے بھتیجے کی مبلغانہ سرگرمیاں برابر پنپ رہی تھیں اور سب سے زیادہ یہ تکلیف تھی کہ عمرہ و حج کے زمانے میں عرب، بیرونِ عرب، بلکہ پوری دنیا کے زائرین حرم تک مسلسل رسائی کے سبب ان کا "جادو" برابر اثر دکھا رہا ہے اور اس کے پیغام کا "چرچا" روز افزوں ہے۔ یہ صورت حال متقاضی تھی کہ نئی منصوبہ بندی کر کے وہ اپنی معاندانہ اور مخالفانہ سرگرمیوں کو پھر سے منظم کریں۔

اس موقع پر ایک اور بڑا حادثہ رونما ہو گیا، یعنی جناب ابو طالب کی وفات کے چند روز بعد ہی 11 رمضان 10 نبوی میں حضور سرور عالم ﷺ کی رفیقۂ حیات (ام المومنین) حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا بھی انتقال ہو گیا۔[1] اس طرح جناب ابو طالب کی حمایت و نصرت کا جو فائدہ اسلامی تحریک کو مسلسل ہو رہا تھا، ان کی وفات کے بعد منقطع ہو گیا۔ اس پر مستزاد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی رحلت نے ان گنت اثرات و نقصانات کے علاوہ بطور

1- مولانا سعید انصاری ندوی، سیر الصحابیات مع اسوۂ صحابیات، دار الاشاعت کراچی، 1979ء ص 28۔

خاص حضورا کرم ﷺ کو بہت زیادہ دل شکستہ کر دیا۔ مجموعی طور پر ان دونوں حادثات کے علاوہ بقول مولانا شبلی، صحابہ خود اپنی حالت میں مبتلا تھے۔ یہی زمانہ ہے جو اسلام کا سخت ترین زمانہ ہے اور خود آنحضرت ﷺ اس سال کو عام الحزن (سال غم) فرمایا کرتے تھے۔[1] اس سال (10 نبوی) میں حادثات وسانحات کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رہا۔

مکی جاہلی ارباب اثر کو تو گویا اِن ہی حالات کا انتظار تھا۔ ان کی راہ کی دونوں بڑی رکاوٹیں ختم ہو گئیں تو ان کے حوصلے بلند ہو گئے اور اتنی ہمت وجرات پیدا ہو گئی کہ خود ذات رسالت مآب ﷺ تک رسائی حاصل کر سکیں۔ چنانچہ اسی زمانہ میں آنحضور ﷺ تک اذیت رسانی کی متعدد مثالیں سیرت کی تمام کتابوں میں نقل کی گئی ہیں۔[2]

اس پورے دور میں حالات و واقعات کے نتیجہ میں جو تاثر ہمارے موٴقر سیرت نگار پیش کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کارپردازان معاشرتِ جاہلیہ کا پلڑا ہر لحاظ سے بھاری تھا اور آنحضور ﷺ سمیت اراکین معاشرۂ نبوی تمام معاملات کو پس انگیز کر رہے تھے اور وقت جیسے تیسے گزر رہا تھا۔ ہمارے نزدیک تاریخ سے اس "تاثر" کی تائید نہیں ہوتی اور نبوی معاشرہ کا ارتقاء بجائے خود "متاثر کن" نظر نہیں آتا، حالانکہ اُسوۂ رحمۃ للعالمین سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عمر کے ہر حصہ میں سیدوسرور نے حالات وواقعات کی ہر کروٹ میں خیر، صلاح وفلاح اور عدل وانصاف کی کوششوں میں حصہ لیا۔ مثلاً بعثت مبارکہ سے بہت پہلے حلف الفضول کے معاہدے میں سید عالم ﷺ نے شرکت فرمائی جب کہ آپ کی عمر شریف صرف بیس سال تھی۔ یہ معاہدہ حضرت زبیر بن عبدالمطلب کی تحریک پر عبداللہ بن جدعان کے گھر پر ہوا تھا۔ مقصد تھا "ظالم کے خلاف مظلوم کی مدد یہاں تک کہ ظالم مظلوم کو اس کا حق ادا کرے" حضور ﷺ اس معاہدہ میں شرکت پر اظہار مسرت فرمایا کرتے تھے اور یہ کہا کہ اس قسم کے معاہدہ کی دعوت اسلام میں بھی کوئی دے تو قبول کر لوں گا (وَلَوْ دُعِيتُ لَهُ لأَجَبْتُ وَهُوَ حِلْفُ الْفُضُولِ)[3] یہ معاہدہ مدتوں نافذالعمل رہا۔ اس کے مزید 15 سال بعد جب کہ آپ حضرت خدیجہ کے ساتھ حبالۂ عقد میں آچکے تھے لیکن بعثت سے مشرف نہیں ہوئے تھے (اور عمر شریف 35 سال تھی) کہ تعمیر بیت اللہ کے موقع پر حجر اسود کو اصل موقع ومحل پر نصب کرنے کے

1- سیرت النبی ﷺ، ج1، ص168)
2- دیکھیے: ایضا، ص69-168
3- الطبقات الکبری، ج1، ص103۔

مسئلہ پر سرداران قریش کے تنازع میں صادق وامین حضور نبی کریم ﷺ کا فیصلہ اور اقدام پوری نیک نیتی کے ساتھ سب کی رضامندی سے ہوا اور کشیدہ ماحول میں خیر کی برکت سب کو میسر آئی۔ یوں "لعقة الدم" ہو جانے کے بعد بھی "امن وامان" اور خیر وعافیت کا دور دورہ ہو گیا۔

پھر عہد رسالت میں (واقعۂ شعب ابی طالب کے بعد بھی) آپ ﷺ کے اس مشن میں (مظلوموں کی دادرسی، سماجی انصاف اور فلاحی کاموں میں) کوئی کمی نہیں آئی، نہ آپ کا عزم متاثر ہوا، نہ آپ ڈرے، نہ جھجکے، نہ مداہنت اختیار فرمائی۔ اہل سیر نے اس رویہ کے عکاس بہت سے واقعات نقل کئے ہیں جن کی تفصیل ممکن نہیں اشارات ہی کئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً اراشی کا واقعہ جس کا حق ابو جہل جیسے بااثر سردار نے مارا تھا۔ حرم میں موجود سرداروں نے تو اراشی سے ازراہ تمسخر ہی کہا تھا کہ یہ جو صاحب یعنی محمد ﷺ بیٹھے ہیں، ان کے ساتھ جاؤ وہ تمہارا حق تمہیں دلوا دیں گے لیکن اگلے لمحات ایسے تحیر خیز تھے کہ ناقابل یقین ! آنحضور ﷺ بلا تامل مظلوم کے ساتھ ابو جہل کے گھر گئے اسے ادائیگی کا حکم دیا اور بس مسئلہ حل ہو گیا دوسرے تو کیا ابو جہل خود مبہوت تھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔ اسی طرح زبیدی کا واقعہ جس کے ساتھ ابو جہل کی طرف سے کیا گیا ظلم وتعدی کے معاملہ کو آنحضور ﷺ نے خوش اسلوبی سے حل کرا دیا اور خود ابو جہل کو تنبیہ کردی (يَا عَمْرُو: إِيَّاكَ أَنْ تَعُودَ لِمِثْلِ مَا صَنَعْتَ بِهَذَا الأَعْرَابِيِّ فَتَرَى مِنِّي مَا تَكْرَهُ)[1] وہ کوئی گستاخی تو کیا کرتا عاجزانہ عرض کرنے لگا نہیں نہیں اے محمد ﷺ ایسا پھر ہر گز نہ کروں گا۔ (لا أَعُودُ يَا مُحَمَّدُ، لا أَعُودُ يَا مُحَمَّدُ)۔ اسی طرح ایک دن حرم میں رؤسائے قریش جمع تھے، آپس میں آنحضور ﷺ کے ذکر پر سب کہنے لگے جتنا صبر ہم نے اس شخص کے طرز عمل پر کیا ہے ایسا صبر ہم نے کبھی کسی کے لیے نہیں کیا۔ اس دوران رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے اور حسب معمول طواف فرمانے لگے تو ان رؤسا نے پاس سے گزرتے ہوئے پھبتیاں کسیں اور نازیبا جملے ادا کیے۔ حضور ﷺ نے طواف کے تین چکروں میں تو برداشت کیا اور چوتھے میں آپ ان کے سامنے رک گئے اور ڈانٹتے ہوئے فرمایا: (تَسْمَعُونَ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ، أَمَا وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ، لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِالذَّبْحِ)[2] (قریشیو! میری بات سن رہے ہو اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے میں تمہارے پاس قتل وہلاکت کا

1- عیون الأثر، ج1، ص132۔

2- احمد بن حنبل، المسند، مُسْنَدُ الْمُكْثِرِينَ مِنَ الصَّحَابَةِ، مُسْنَدُ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ، رقم الحدیث 7036۔

پیغام لے کر آیا ہوں۔) یہ سنتے ہی رؤسائے قریش کے اوسان خطا ہو گئے، گردنیں جھک گئیں اور بہت نرمی سے کہنے لگے اے ابو القاسم کچھ نہیں آپ آرام سے تشریف لے جایئے (العرف اباالقاسم راشداً) اور ایک دن تو آخر کار حضور ﷺ نے بارگاہ الٰہی میں یہ عرض کر کے ان کی قسمتوں کا فیصلہ ہی کر دیا۔ اللَّهُمَّ عَلَيْكَ بِأَبِي جَهْلٍ، وَعَلَيْكَ بِعُتْبَةَ بْنِ رَبِيعَةَ، وَشَيْبَةَ بْنِ رَبِيعَةَ، وَالوَلِيدِ بْنِ عُتْبَةَ، وَأُمَيَّةَ بْنِ خَلَفٍ، وَعُقْبَةَ بْنِ أَبِي مُعَيْطٍ ۔[1]

کم و بیش اسی زمانہ (7 تا 9 نبوی) میں جبکہ کفار مکہ کی مخالفانہ روش شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے دعا کی کہ "خدایا یوسف کے جیسے ایک قحط سے میری مدد فرما"۔ حضور ﷺ کا خیال تھا کہ جب ان لوگوں پر مصیبت پڑے گی تو انہیں خدا یاد آ جائے گا اور ان کے دل نصیحت قبول کرنے کے لیے نرم پڑ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا قبول فرمائی اور سارے علاقہ میں ایسے زور کا قحط پڑا کہ لوگ بلبلا اٹھے۔[2] یہ قحط چونکہ نبی کریم ﷺ کی استدعا پر آیا تھا اور حضور ﷺ نے اس کے لیے دعا اس خیال سے کی تھی کہ مصیبت پڑے گی تو کفار کی اکڑی ہوئی گردنیں ڈھیلی پڑ جائیں گی مگر یہ توقع عبث ثابت ہوئی اور معلوم ہو گیا کہ محض ایک قحط ان کی غفلت دور نہیں کر سکتا۔

حضور اکرم ﷺ کی دعا کے نتیجہ میں قریش پر سات سالہ قحط مسلط کیا جانا معمولی واقعہ قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن ہمارے ہاں اکثر و بیشتر سیرت نگاروں کے ہاں اس کا نہ ذکر ہے نہ اشارہ، اس کے نتائج و اثرات سے بحث تو دور کی بات ہے۔ علامہ ابن کثیر نے البتہ اس کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ دعائے نبوی (اللهُمَّ أَعِنِّي عَلَيْهِمْ بِسَبْعٍ كَسَبْعِ يُوسُفَ) کے نتیجہ میں قریش مکہ بری طرح متاثر ہوئے یہاں تک کہ بھوک سے مجبور ہو کر وہ الا بالا سب کھا گئے یہاں تک کہ مردار بھی۔[3] بھوک کی شدت سے انہیں

1- صحیح بخاری، كِتَابُ الوُضُوءِ، بَابُ إِذَا أُلْقِيَ عَلَى ظَهْرِ المصَلِّي قَذَرٌ أَوْ جِيفَةٌ، لَمْ تَفْسُدْ عَلَيْهِ صَلاَتُهُ، رقم الحدیث 240۔ تفصیلات وواقعات کے لیے ملاحظہ ہو: پیر کرم شاہ الازہری، ضیاء النبی، ضیاء القرآن، پبلی کیشنز لاہور، ج2، ص303 تا318

2- ملاحظہ ہو: مولانا مودودی، تفہیم القرآن، لاہور2009ء ج4، دیباچہ سورۃ الدخان ص556

3- وَذكر البيهقى هَا هُنَا دُعَاء النَّبِي صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى قُرَيْشٍ حِينَ اسْتَعْصَتْ عَلَيْهِ بِسبع مثل سبع يُوسُفَ (ابن کثیر، السیرۃ النبویہ، بیروت، ج2، ص89) اور حضرت ابن مسعود کی روایت میں الفاظ یہ ہیں۔ "أَنَّ

لگتا تھا کا جیسے ہر طرف دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا ہے۔[1]

قحط سالی باشندگان مکہ مکرمہ کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔[2] جناب عبد المطلب کے زمانہ میں جب ایسی ہی صورت پیدا ہوئی تو موصوف اپنے پوتے کو لے کر خانۂ کعبہ گئے اور اس کے واسطہ سے دعا مانگی جبکہ یہی صورت حال جناب ابو طالب کے زمانہ میں ہوئی تو انہوں نے بھی اپنے بھتیجے گورے مکھڑے والے کے روئے زیبا کے واسطے سے ابر رحمت کی دعائیں مانگی تھیں جن کا ذکر ان کے قصیدۂ لامیہ میں صراحۃً مذکور ہے۔ اب نہ عبد المطلب تھے نہ ابو طالب اس لیے ہفت سالہ قحط سے پریشان ہو کر سرداران قریش ابو سفیان کی سرکردگی میں بالآخر خدمت رسالت پناہ **علیہ التحیۃ والصلوۃ** میں حاضر ہوئے[3]۔

ان کے عرض مدعا سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضور سید عالم ﷺ نے رحم وتلطف کے دریا بہائے ہوں گے۔ بہر حال ہفت سالہ قحط کا مطلب یہ ہے کہ کفار قریش جس وقت (7 تا 10 نبوی) معاشی، معاشرتی مقاطعہ کی سزا بنو ہاشم بنو المطلب کو دے رہے تھے اس وقت بھی وہ قحط کی سختیوں سے گزر رہے تھے بلکہ آئندہ ایک عرصہ تک ان کی گلو خلاصی ممکن نہ ہو سکی ہو گی۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ نبوی مکی معاشرہ ارتقاء کی جن منزلوں سے گزر رہا تھا اس میں آپ ﷺ نے وقار وتمکنت کو اور پورے دور ابتلاء میں بانکپن کو قائم رکھا۔

---قُرَيْشًا لَمَّا اسْتَعْصَتْ عَلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبْطَأُوا عَنِ الْإِسْلَامِ قَالَ: «اللهُمَّ أَعِنِّي عَلَيْهِمْ بِسَبْعٍ كَسَبْعِ يُوسُفَ"

1- اس سلسلہ میں قرآن میں سورۂ دخان کی آیات (10 تا 16) واقعہ سے مناسبت رکھتی ہیں۔ مزید تفصیلات کے لیے تفہیم القرآن، ج4، ص63-562، کے ذیل میں حاشیہ نمبر 13 قابل توجہ ہے۔

2- مولانا مودودیؒ کی تصریح کے مطابق "نبی ﷺ کے دور میں اہل مکہ کو دو مرتبہ قحط سے سابقہ پیش آیا ہے ایک نبوت کے آغاز سے کچھ مدت بعد دوسرا ہجرت کے کئی سال بعد جب کہ ثمامہ بن آثال نے یمامہ سے مکے کی طرف غلے کی بر آمد روک دی تھی۔ یہاں آیت 75، 76 سورۃ المومنون کے حوالہ سے ذکر پہلے قحط کا ہے۔ صحیحین میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ہے کہ جب قریش نے نبی کریم ﷺ کی دعوت قبول کرنے سے پیہم انکار کر دیا اور سخت مزاحمت کی تو حضور ﷺ نے دعا کی " اللهُمَّ أَعِنِّي عَلَيْهِمْ بِسَبْعٍ كَسَبْعِ يُوسُفَ "خدایا ان کے مقابلہ میں میری مدد یوسف کے ہفت سالہ قحط جیسے سات برسوں سے کر (مودودی، تفہیم القرآن، لاہور 2009ء، ج 3، ص93-292) اس قحط کی طرف مکی صورتوں میں بکثرت اشارات ملتے ہیں مثال کے طور پر ملاحظہ ہو الانعام، 42 تا 44، الاعراف، 94 تا 99، یونس، 11، 12، 21، النحل 112، 113، الدخان، 10 تا 16 مع حواشی (تفہیم القرآن، ج3، ص294)

3- احمد بن القطلانی، المواہب اللدنیہ، مکتبہ توفیقیہ، مصر، ج3، ص32۔

نبوی مکی معاشرہ کا ارتقاء:(6)

10 نبوی کا وہی عام الحزن جاری تھا۔ حضور سید عالم ﷺ نے حالات واحوال سے یہ اندازہ فرمایا کہ مکہ میں ابلاغ حق کی مزید کوششوں کے بجائے دوسرے مواقع تلاش کیے جائیں کہ نئے علاقے، نئی زمینیں، نئے لوگوں سے رابطہ نئے امکانات پیدا کر سکتا ہے۔ اسی سلسلہ کی کڑی تھی کہ عمرہ وحج کے زمانے میں زائرین حرم سے ملاقاتیں اور ان تک پیغام رسانی کا اہتمام آپ ﷺ پہلے سے ہی فرما رہے تھے (جس میں خاطر خواہ اضافہ شعب ابی طالب کے زمانۂ محصوری میں ہوا اور آئندہ بھی جاری رہا۔) بہر حال مکہ معظمہ سے باہر ابلاغ حق کے خیال سے آپ ﷺ نے طائف جانے کا عزم فرمایا۔ اس سلسلہ میں حضرت زید بن حارثہ کی معیت میں ہادئ اعظم نے شوال 10 نبوی میں طائف جاتے ہوئے راستہ میں متعدد مقامات پر دعوت حق کا فریضہ انجام دیا یہاں تک کہ وہاں کے حکام ورؤسائے شہر طائف (عبدیالیل، مسعود، حبیب) تک جا پہنچے اور دعوت توحید وایمان دی، مگر وہ ایمان تو کیا لاتے، آپ ﷺ کی ہر بات مسترد کر کے یہ مطالبہ بھی کر دیا کہ آپ ﷺ ہمارے شہر سے نکل جائیں، مزید بر آں شہر کے اوباشوں کو پیچھے لگا دیا کہ آپ سے بدتمیزی بدسلوکی کریں۔[1]

قدیم وجدید تمام اصحاب سیر نے آنحضور ﷺ سے سفر طائف میں پیش آنے والے اندوہ ناک واقعات اور وہاں کے ارباب اختیار کے جوابی افسوسناک رویہ پر تفصیل سے لکھا ہے جسے دھرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

بہر حال طائف سے واپسی کے سفر میں نخلہ کے مقام پر حضور علیہ الصلواۃ السلام نے کئی روز قیام فرمایا۔ اسی دوران ایک رات نماز میں قرآت بالجہر فرمائی تو نصیبین کے متوطن سات جنات کے ایک گروہ نے وہاں سے گزرتے ہوئے قرآن کو سنا تو متاثر ہوئے اور ایمان لے آئے اور پھر اپنی قوم میں جا کر انذار وابلاغ کا فریضہ انجام دیا تو وہ سب بھی ایمان لے آئے۔ جنات کے ایمان لانے اور سماعت قرآنی کی اطلاع آنحضور ﷺ کو بذریعہ وحی پہنچائی گئی جو شاید آپ ﷺ کو یہ سمجھانے کے لیے تھی کہ اگر انسانوں کو انکارِ دعوتِ حق پر اصرار ہے تو فکر نہ کیجئے انسانوں سے زیادہ جنات کی آبادی ہے وہ پورے خلوص کے ساتھ دین وایمان کا اقرار کر چکے ہیں۔[2]

1- ابن سعد نے ان کی گفتگو نقل کی ہے: يَا مُحَمَّدُ اخْرُجْ مِنْ بَلَدِنَا وَالْحِقْ بِمُجَابِكَ مِنَ الأَرْضِ (ج1، ص165)

2- سورۃ الاحقاف میں جنوں کے آنے اور قرآن سن کر واپس جانے کا واقعہ بیان ہوا ہے جس کا ذکر آیات 29 تا 32 میں

اَجِنّہ کا دخولِ ایمان زیادہ معنی رکھتا ہے اس لیے انسانوں کے استردادِ ایمان واسلام سے قطعاً پریشان نہ ہوں اور جمع خاطر رکھیں کہ دعوت حق انسانوں سے بڑھ کر جنات میں پھیل رہی ہے۔ اس لیے توسیع دعوت اور توسیع معاشرہ کے ضمن میں فکر کی ضرورت نہیں کیونکہ معاملہ اب "مقامی یا محدود" نہیں رہا ہے بلکہ "آفاقیت" سے متمتع ہو چکا ہے۔ "آفاقیت" کا تیقن مزید اس طرح ہوا کہ طائف سے واپس سفر میں ہی آپ ﷺ کے فرق مبارک پر {وَمَآ أَرۡسَلۡنَٰكَ إِلَّا رَحۡمَةٗ لِّلۡعَٰلَمِينَ ﴿١٠٧﴾ }[1] کا تاج سجا دیا گیا۔ یہ گویا اس بات کا ربانی بیان تھا اور حرف تسلی بھی کہ اے محبوب آپ صرف مکہ طائف یا عرب کی دوسری بستیوں کے لیے ہی نہیں بلکہ چار دانگ عالم کے لیے، سارے عالموں کے لیے، رحمتوں کی برسات برسانے کے لیے مبعوث فرمائے گئے ہیں۔ آپ عالمی آفاقی پیغمبر ہیں۔ آپ کی نبوت، رسالت، رحمت ہر حد وانتہا سے آگے، ہر زمانہ سے ماوراء، آفاق سے بھی پرے، سدرۃ المنتہٰی سے بھی آگے ہے جس کا نظارہ آپ جلد ہی سفر "معراج" میں تجلی مآب ہو کر خود کر سکیں گے۔

واقعہ "معراج" روایات کے مطابق عام الحزن 10 نبوی کے اواخر یا اگلے سال 11 نبوی میں پیش آیا[2]۔ جو اس وقت کے حال و مستقبل میں "نبوی معاشرہ کے ارتقاء" کی دلیل اعظم اور آئندہ کے لیے کامیابیوں اور کامرانیوں کی نوید تھی۔ سفر معراج کا ہر پہلو قابل ذکر اور تفصیلات کا مرقع ہے، جس پر یہاں گفتگو ممکن نہیں۔ تاہم آفاقیت کا پہلو اگرچہ کئی اعتبار سے مترشح ہوتا ہے لیکن سفر معراج میں آپ ﷺ کی امامت خاص اشارہ ہے آپ کی آفاقیت کا۔ "مولانا ابو الحسن علی ندوی" معراج کے بلند ولطیف مطالب و معانی کے تحت لکھتے ہیں کہ "یہ دونوں سورتیں سورۂ اسراء اور سورۂ نجم" جو واقعۂ معراج کے سلسلہ میں نازل ہوئیں یہ اعلان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دونوں قبلتوں (مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ) کے نبی اور دونوں

۔۔۔ آیا ہے۔ مولانا مودودی کے بقول حدیث وسیرت کی متفق علیہ روایات کی رو سے یہ اس وقت پیش آیا تھا جب نبی ﷺ طائف سے مکہ معظمہ کی طرف پلٹتے ہوئے نخلہ کے مقام پر ٹھہرے تھے۔ (تفہیم القرآن، ج4، ص596) مولانا کی تحقیق کے مطابق ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں جنوں سے رابطہ چھ مرتبہ ہوا تھا، اور ان کے چھ وفد آپ ﷺ کے پاس آئے تھے۔ (تفصیل کے لیے، ایضاً ص20۔619)

1- سورۃ الانبیاء:107

2- ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے: ایک روایت کے مطابق معراج 27 رجب المرجب، ہجرت سے قبل 21۔620ء مطابق 11 یا 12 نبوی کو ہوئی (ڈاکٹر حمید اللہ، محمد رسول اللہ) ترجمہ وتوضیح پروفیسر خالد پرویز، بیکن بکس لاہور، 2005ء، ص103

سمتوں مشرق و مغرب کے امام اور اپنے پیش رو تمام انبیاء کرام کے وارث اور بعد میں آنے والی پوری نسل انسانی کے رہبر ور ہنما ہیں۔ آپ کی شخصیت اور آپ کے سفر معراج میں مکہ بیت المقدس سے اور مسجد حرام مسجد اقصیٰ سے ہم آغوش ہو گئی۔ آپ کی امامت میں تمام انبیاء نے نماز پڑھی اور یہ دراصل آپ کے پیغام و دعوت کی عمومیت و آفاقیت، آپ کی امامت کی ابدیت اور ہر طبقہ انسانی کے لیے آپ کی تعلیمات کی ہمہ گیری وصلاحیت کی دلیل و علامت تھی[1]۔ آگے رقمطراز ہیں کہ "واقعۂ معراج دراصل ایک محدود مقامی اور عارضی ۔۔۔اور نبوت کی ابدی اور عالمگیر شخصیت کے درمیان خط فاصل اور امتیازی لکیر کی حیثیت رکھتا ہے۔[2] آگے لکھتے ہیں "واقعۂ معراج یہ اعلان کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان قومی اور سیاسی رہنماؤں کی صف سے کوئی تعلق نہیں رکھتے جن کی صلاحیتوں اور کوششوں کا دائرہ اُن کے ملک یا اُن کی قوم تک محدود ہوتا ہے[3]۔ نیز رقمطراز ہیں "وہ اللہ کے بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں کی صف ہے جو آسمان کا پیغام زمین والوں کو اور خالق کا پیغام مخلوق کو پہنچاتے ہیں اور ان سے پوری نوع انسانی، زمانہ و تاریخ رنگ و نسل اور ملک و قوم سے قطع نظر سرفراز و سربلند ہوتی ہے اور اس کی قسمت جاگتی ہے[4]۔

واقعۂ معراج اُس وقت کے حالات وواقعات کے تناظر میں[5] بہت اہمیت رکھتا ہے کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ بظاہر کمزوری، پستی اور گراوٹ کی کوکھ سے عروج جنم لے سکتا ہے اور عروج بھی ایسا عظیم الشان کہ جس سے زیادہ کا تصور بھی ممکن نہیں۔ سدرۃ المنتہٰی سے بھی آگے تقرب الٰہی کی انتہا ناممکن البیان حد تک (فَاَوْحٰی اِلٰی عَبدِہٖ مَا اَوْحٰی) وہاں سے واپسی میں عرش کے خزانوں میں سے

1- مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، نبی رحمت ﷺ (ترجمہ مولوی محمد عبدالحئی) مجلس نشریاتِ اسلام کراچی 1981ء، حصہ اول، ص 148

2- ایضاً ص 49-148

3- ایضاً ص 149

4- ایضاً

5- مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے باقاعدہ عنوان قائم کیا ہے: شعب ابی طالب کے مصائب کی قیمت واقعۂ معراج۔ نیز لکھتے ہیں کہ "جب قصداً بھی اس کو جدا کیا گیا اور ایسے سخت دباؤ ڈال کر جدا کیا گیا جس سے زیادہ دباؤ اس رقیق قلب کے لیے ممکن نہ تھا۔ سمجھا جاسکتا ہے کہ کائنات سے جدائی کی اس رفتار نے آخر کسی دوسری جانب ارتقاء کی کئی منزلیں طے کی ہوں گی۔ جس چیز کو ایک طرف سے دباؤ گے تو دوسری طرف سے اس کا ابھرنا ناگزیر ہے۔ ایک رات میں اتنا عروج، ایسا عروج کس طرح میسر آیا۔ (النبی الخاتم، الفیصل لاہور 1995ء، ص 72-73)

سورۃ البقرہ کی آخری آیات عطا کی گئیں اور امت کے نفس و باطن کی تربیت اور نظام زندگی کو مرتب کرنے کے لیے پنج وقتہ نمازوں کی عبادت فرض کی گئی تاکہ نبض زندگی ہر آن متحرک رہے اور مشاہدہ حضوریٔ حق کی نعمتوں سے متمتع ہوتے ہوئے ارتباط و تسلسل جاری رہے اور ہر بندۂ مومن "الصلوٰۃ معراج المومنین" کے شرف سے مشرف ہوسکے۔ معراج سے کامیاب واپسی کے بعد آپ ﷺ نے دیکھا تو زنجیرِ دَر اُس وقت بھی ہل رہی تھی اور بستر ہنوز گرم تھا پس یہ لمحوں کی بات تھی "عالم بشریت کی زد میں گردوں" آچکا تھا۔

نبوی معاشرہ کی توسیع اور ارتقاء کی اس منزل تک پہنچتے پہنچتے کفار و مشرکین کا ہر ستم صاحب التاج والمعراج اور ان کے جانثاروں کے لیے اپنی قدر و قیمت میں کچھ بھی نہ رہا۔ کمزوری، گراوٹ، بے بسی بے کسی تحلیل ہوگئی اب آگے بڑھنے کے لیے توسیع معاشرہ کی اگلی منزلوں کے لیے ایک ضابطہ، لائحہ عمل کی ضرورت تھی۔ ایک ایسے منشور کی حاجت تھی جس میں تہذیب و معاشرت اور تمدن و سیاست کے بنیادی و ثانوی اصول درج ہوں۔ یہ سب جو اس وقت تھی اور وہ سب جو آئندہ پیش آسکتا تھا، اللہ عزوجل نے معراج کے بعد سب کچھ لکھ کر بذریعہ وحی بہ صورت "سورۃ الاسراء / سورۂ بنی اسرائیل لکھ کر آپ کے حوالے کردی جس میں سب کچھ تفصیل سے بیان کردیا گیا ہے۔[1] اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آئندہ پیش آنے والے امور اور حالات و مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے اصولی، دستوری اور عملی تیاری پہلے سے مکمل کرلی گئی۔

اب ضرورت یہ باقی رہ گئی تھی کہ نبوی مکی معاشرہ اور توسیع و ارتقاء کو اُن وسعتوں تک پہنچا دیا جائے کہ معاہدۂ عمرانی اپنی اصلیت و حقیقت کے اعتبار سے روبہ عمل آئے اور اس کے نتیجہ میں معاشرۂ نبوی بالآخر ایک ریاست پر منتج ہو تاکہ ایک قوت قاھرہ اور قوت نافذہ حاصل ہوجائے۔ اس ضرورت، دعا اور تمنا کو الفاظ کی صورت میں قرآن کریم کی سورۃ الاسراء سورۂ بنی اسرائیل میں شامل کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا {وَقُل رَّبِّ

1- مولانا مودودیؒ نے سورۂ بنی اسرائیل کے دیباچہ میں سورہ کے زمانہ نزول، پس منظر اور موضوعات و مضامین کی تصریح کردی ہے، نیز یہ لکھا ہے کہ سمجھایا گیا ہے کہ انسانی سعادت و شقاوت اور فلاح و خسران کن چیزوں پر ہے، توحید نبوت معاد اور قرآن کے برحق ہونے کی دلیلیں، شبہات کو رفع کیا گیا ہے۔ آگے رقمطراز ہیں: تعلیم کے پہلو میں اخلاق و تمدن کے وہ بڑے بڑے اصول بیان کئے گئے ہیں جن پر زندگی کے نظام کو قائم کرنا دعوت محمدی ﷺ کے پیش نظر تھا۔ یہ گویا اسلام کا منشور تھا جو اسلامی ریاست کے قیام سے ایک سال پہلے اہل عرب کے سامنے پیش کیا گیا تھا، اس میں واضح طور پر یہ بتادیا گیا ہے کہ یہ خاکہ ہے جس پر محمد ﷺ اپنے ملک کی اور پھر پوری انسانیت کی زندگی کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ (دیکھئے تفہیم القرآن، ج2، ص587، ادارہ ترجمان القرآن لاہور 2009ء ملخصاً)

أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَل لِّي مِن لَّدُنكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا ﴿٨٠﴾}[1] اور دعا کیا کرو کہ اے میرے رب مجھے خیر سے (مدینہ میں) داخل کر اور خیر ہی سے نکال (مکہ سے) اور میرے لیے اپنی طرف سے غلبہ و شوکت عطا کر۔(ترجمہ مولانا عبد الحق حقانی)[2] اس کے مفہوم میں بقول مولانا مودودیؒ، یہ داخل ہے کہ یا تو مجھے اقتدار عطا کر یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنادے تا کہ اس کی طاقت سے میں دنیا کے اس بگاڑ کو درست کر سکوں، فواحش اور معاصی کے اس سیلاب کو روک سکوں اور تیرے قانونِ عدل کو جاری کر سکوں۔ اسی کی تائید نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث کرتی ہے کہ (إِنَّ اللّٰهَ لَيَزَعُ بِالسُّلْطَانِ مَا لَا يَزَعُ بِالْقُرْآنِ) یعنی اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سدباب کر دیتا ہے جس کا سدباب قرآن سے نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے وہ صرف وعظ و تذکیر سے نہیں ہو سکتی[3]۔

1۔ سورۃ الإسراء:80

2- مولانا عبد الحق حقانی دہلوی، تفسیر حقانی (پارہ سبحٰن الذی) مکتبہ نعیمیہ دیوبند یوپی، طبع سوم ج2، ص55 تفسیر کے ضمن میں مولانا حقانی نے لکھا ہے: "جو اصل کام ہے یعنی نماز و عبادت اس کو بجالاؤ اس سے غافل نہ رہو دین دنیا میں اس سے سرسبزی اور برتری ہے۔ رہا مکہ سے نکلنا اور قریش کا اس بات کے درپے ہونا یوں یہ ایک امر مقدر ہے جس پر قضاو قدر نے اسلام کی ترقی وابستہ کر رکھی ہے اس لیے اے نبی ﷺ یہ دعا کیا کرو" نیز لکھتے ہیں: اے اللہ مجھے مکہ سے سچائی سے نکال کہ پھر میرے دل میں حب وطن نہ رہے اور ان مشرکوں کی طرف سے پھر تکالیف برداشت نہ کرنی پڑیں اور نیز سچائی کے ساتھ نکالنے سے یہ بھی مراد ہے کہ خاص تیرے ہی لیے اور تیری راہ میں ہجرت ہو کسی دنیاوی غرض یا کسی جرم پر جلاوطنی نہ ہو اور مدینہ میں مجھے سچائی سے داخل کر اور چونکہ اس دین کا تمام دنیا پر پھیلنا ٹھہر چکا ہے اور پردیس میں قوت ہی نہیں رہتی اور نیز مدینہ کے متصل کسریٰ و قیصر کی حکومتیں اور دیگر قبائل شریر و سرکش بھی ہیں اس لیے یہ بھی دعا کرو کہ مجھے اپنے ہاں کی قوت و شوکت بھی عطا کر چنانچہ آنحضرت ﷺ کو مدینہ میں حسب بشارت زبور، اللہ تعالیٰ نے وہ قوت و شوکت عطا کی جس سے دنیا میں آسمانی سلطنت قائم ہوئی۔ (ایضاً ص58 ملخصاً)

3- مودودیؒ، تفہیم القرآن، ج2، ص637، اس دعا کی تلقین سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کا وقت اب بالکل قریب آ گیا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ تمہاری دعا یہ ہونی چاہئے کہ صداقت کا دامن کسی حال میں تم سے نہ چھوٹے۔ جہاں سے بھی نکلو صداقت کی خاطر نکلو اور جہاں بھی جاؤ صداقت کے ساتھ جاؤ۔ (حاشیہ 99)

نبوی مکی معاشرہ-کمالِ ارتقاء:(7)

عام الحزن 10 نبوی اور 11 نبوی کے اوائل تک نبوی مکی معاشرہ ارتقائے کمال کی جانب رواں دواں ہو گیا۔ دین وایمان کی بنیاد پر استوار ہونے والا معاشرہ ابتدائے عہد سے ہی آفاقیت آشنا تھا، وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مجتمع پیش آنے والی تمام آزمائشوں سے بحسن وخوبی نبرد آزما ہو تارہا، یہاں تاکہ 7 نبوی سے 10 نبوی تک کا آلام ومصائب کا وہ دور بھی جو شعب ابی طالب کی محصوری کے نتیجہ میں پیش آیا انہیں باہم دگر مضبوط کر گیا اور شاید اس نظری فکری ارتباط واجتماعیت کو حسی مادی شکل دینے کے لیے آنحضور ﷺ نے قیام مکہ کے دوران ہی اہل ایمان کے درمیان ایک عہد مواخاۃ استوار فرمایا جس سے شاید اس حقیقت وخصوصیت کو موکد کرنا تھا کہ بننے والا نیا معاشرہ حسب ونسب، نسل ووطن، لون ولسان اور جاہلی غرور وافتخار یا دوسرے قسم کے امتیازات وتعصبات سے پاک ہے اور صرف اساس ایمان پر قائم ہے۔ مواخاۃ مکہ کو ہمارے ہاں عام کتب سیرت میں اگرچہ بیان نہیں کیا جاتا لیکن تاریخی مآخذ میں تفصیل موجود ہے۔[1]

اس مواخاۃ کے ذریعہ گویا رسول اللہ ﷺ نے اپنے تمام دعووں کو ایک طرح کی قانونی شکل دے دی اور عملاً اس بات کا ثبوت فراہم کر دیا کہ ایمان کی اساس پر بننے والا معاشرہ سب سے الگ ہے۔ مختصر یہ کہ نبوی مکی معاشرہ کی ایک گونہ تکمیل ہو گئی۔

پھر اگلے تین سال میں یعنی نبوت کے 11 ویں، 12 ویں اور 13 ویں سال میں مکی جاہلی معاشرہ اور نبوی مکی معاشرہ، دونوں اپنے اپنے طور پر فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ مثلاً اگر ایک طرف جاہلی مکی معاشرہ کے کارپردازان اور بااثر قبائل نے ہر طرح کی کوشش کر کے، ہر قسم کی منفی کارروائیاں، اور ہر نوع کے ظلم وستم ڈھا کر دیکھ لیا کہ حضور ﷺ اور اہل ایمان کی سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑا، کوئی ایک آدمی بھی توڑا نہیں جاسکا، بلکہ لمحہ بہ لمحہ ان کا جذبہ فزوں تر ہوتا جارہا ہے اس لیے آخری چارۂ کار کے طور پر دارالندوہ میں

1- محمد بن حبیب بغدادی نے کتاب المحبر میں شرکائے مواخاۃ کی تفصیل دی ہے اور سب سے پہلے حضور ﷺ اور حضرت علی کے درمیان، پھر حضرت حمزہ اور حضرت زید بن حارثہ کے درمیان، حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کے درمیان، حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے درمیان، حضرت زبیر بن العوام اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے درمیان وغیرہ وغیرہ۔ ٹھیک یہی فہرست ابن سید الناس نے بھی نقل کی ہے۔ (مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: ڈاکٹر نثار احمد، عہد نبوی میں ریاست کا نشوو ارتقاء۔ نشریات لاہور 2008ء، ص 34-131)

جمع ہو کر فیصلہ کرنا ہو گا کہ آنحضور ﷺ کو قید کیا جائے یا قتل کر ڈالیں یا جلا وطن کر دیں۔ {وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ ٱللَّهُ ۖ وَٱللَّهُ خَيْرُ ٱلْمَٰكِرِينَ }[1] پھر آخرکار آغاز صفر 13 نبوی سے پہلے انہوں نے دار الندوہ میں جمع ہو کر بالاتفاق یہ فیصلہ کر ڈالا کہ بقول ابوجہل "ہر قبیلہ سے ایک شخص کا انتخاب ہو اور پورا مجمع ایک ساتھ مل کر تلواروں سے ان کا خاتمہ کر دے۔[2] ان کے اس فیصلہ کی اطلاع اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضور ﷺ کو پہنچا دی۔[3] دوسری طرف مکی نبوی معاشرہ 11 نبوی کے اوائل تک اپنے خدوخال بہ ایں معنیٰ مکمل کر چکا تھا کہ سفر طائف کے بعد مکہ مکرمہ اور اس کے مضافات تک تمام علاقوں میں ابلاغ حق اور تبلیغ دین کو بدرجۂ انتہاء پہنچادیا گیا اور 13،12 نبوی تک ان پر حجت تمام کر دی گئی اور اذن ہجرت دیتے ہوئے فرمادیا گیا۔ {لَقَدْ حَقَّ ٱلْقَوْلُ عَلَىٰٓ أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٧﴾}[4] اور مزید موکد کرتے ہوئے ارشاد ہے: ان کے لیے یکساں ہے تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے {وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٠﴾}[5] عبادت کے مکلفین کا دوسرا گروہ اَجِنَّۃ کا ہے وہ بھی ایمان لے آیا، رحمۃ للعالمین سے متصف فرما کر آپ ﷺ کی صفت رحمت و آفاقیت کا اعلان اور معراج عطا کر کے عروج اور تقرب الٰہی کی انتہاء سے مشرف فرما کر نماز خمسہ کی فرضیت اور آپ ﷺ کی امامت، آفاقیت و ابدیت کا اعلان واثبات فرمادیا گیا۔ معراج کے بعد سورۃ الاسراء کا نزول مستقبل کی پیش قدمی کے لیے ضابطۂ عمل اور تہذیب و تمدن، معاد و معاش اور دینی و دنیوی زندگی کے اصول وہدایت پر مبنی منشور عطا کر دیا گیا۔ اب صرف قوت قاہرہ اور قوت نافذہ حاصل کرنے کے لیے اقتدار و سلطنت کا حصول باقی رہ گیا تھا جس کے لیے معاہدۂ

1- سورۃ الانفال:30
2- سیرۃ النبی ﷺ، ج1، ص261
3- دیکھیے۔ الزخرف:79،80
4- سورۃ یس:7
5- سورۃ یس:10

عمرانی کی شرط تھی۔[1] جس کا انتظام واہتمام اہل مدینہ کی آمد وملاقات اور بیعت ہائے عقبہ کے ہر انعقاد کی صورت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ بیعت ہائے عقبہ اول دوم سوم کو ترتیب میں اولاً قبول اسلام ثانیاً بیعت النساء اور ثالثاً بیعت العرب کی تصریح مآخذ میں موجود ہے اس میں سے آخری بیعت عقبۂ کبیرہ جس میں اہل مدینہ کے تقریباً 75 حضرات نے شرکت فرمائی آنحضور ﷺ سے تبادلہ خیال اور بیعت کے بعد مدینہ آنے کی دعوت دی اور آپ ﷺ کی حفاظت کا وعدہ کیا۔ دراصل یہی وہ "معاہدۂ عمرانی" تھا جس کی بنیاد پر ہجرت واقع ہوئی اور ایک ریاست معرض وجود میں آگئی۔

بیعت ہائے عقبہ کی جو تفصیلات تاریخ مآخذ میں پائی جاتی ہیں اُن پر مفصل گفتگو یہاں پیش نہیں کی جاسکتی اس لیے محض ایجاز واختصار ہی ممکن ہے۔ مجملہ اور باتوں کے یہ امر قابل ذکر ہے کہ "بیعت عقبہ کبیرہ" کی صورت میں جو "معاہدۂ عمرانی" منعقد ہوا وہ ایک واقعی اور حقیقی معاہدہ تھا جو باشندگانِ ریاست اور ان کے نمائندوں نے مجوزہ سربراہِ ریاست سے پورے غور وخوض کے ساتھ، باہمی یقین دہانی کے ساتھ اور سب سے بڑھ کر آزادانہ رائے مشورہ اور دلی رضامندی کے ساتھ انجام کو پہنچا۔ لیکن یہ رضامندی محض رسماً یا تکلفاً نہیں تھی بلکہ اہل ایمان نے تمام نتائج وعواقب کا پوری طرح ادراک کر کے نبی کریم ﷺ کے ہاتھ میں ہاتھ

1- علم سیاسیات وسماجیات کے حوالہ سے "معاہدۂ عمرانی" ایک ایسی علمی اصطلاح ہے جس کے بارے میں مشرق ومغرب کے علماء فضلاء اور مفکرین نے اپنے اپنے زمانہ میں بہت کچھ لکھا اور مسلمانوں میں سے خاص طور پر ایسے بلند پایہ مفکرین کی ایک بڑی تعداد ہے جنھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور عظیم تصانیف یادگار چھوڑیں۔ ان مفکرین میں سے فارابی، ابن خلدون اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نمایاں ہیں۔ معاہدۂ عمرانی کے حوالہ سے مغربی مفکرین میں سے ھابس 1609ء، لاک 1704ء اور روسوم 1778 کے نظریات وخیالات جو انہوں نے لوگوں کے سامنے ظاہر کئے انہیں اپنے زمانہ میں یعنی سولہویں، سترہویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں واقعی بڑی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان صاحبان فکر ونظر میں سے کوئی ایک بھی کسی ایسے "معاہدۂ عمرانی" کو دریافت نہ کرسکا جو تصور متجرد سے آگے بڑھ کر واقعاتی تاریخی اور حقیقی طور پر کبھی کہیں وقوع پذیر ہوا ہو، مگر ہاں یہ فخر وامتیاز انسانی تاریخ میں صرف رسول اکرم، نبی محتشم، محسن انسانیت ﷺ کو حاصل ہے۔ آپ ہی کی ذات فضیلت مآب نے عملاً اصلاً اور واقعتاً ایک "معاہدۂ عمرانی" کو حقیقی واقعاتی وجود بخشا اور ہجرت مدینہ سے پہلے بیعت عقبۂ کبیرہ کی صورت میں آئندہ قائم ہونے والی ریاست ومملکت کے اصل باشندگان ونمائندگان سے برضا ورغبت "معاہدۂ عمرانی" استوار فرمایا۔ (مزید بحث وتفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ڈاکٹر نثار احمد، **عہد نبوی میں ریاست کا نشوو ارتقاء** ص 136 ومابعد)

دیا تھا۔ یہ بیعت محض اظہار عقیدت کے لیے نہیں تھی نہ محض قبول اسلام کے لیے تھی۔ انصار نے رضا ورغبت کا اظہار مع عزم بالعزم کیا تھا اور تمام خطرات کے علی الرغم آپ ﷺ اور آپ کے اصحاب کو اپنے شہر میں جگہ دینے، حمایت و نصرت اور حفاظت کرنے، ہر حال میں اسلام پر قائم رہنے اور ہر موقع پر سمع وطاعت سے کام لینے کا وعدہ تھا۔ یہی وہ تاریخی عہد و معاہدہ تھا جس نے نہ صرف عرب بلکہ بعد کی پوری عالمی تاریخ پر فیصلہ کن اثرات مرتب کئے اور ریاست نبوی ﷺ کے قیام کو فیصلہ کن مرحلہ میں داخل کر دیا۔

نبوی ﷺ مدنی معاشرہ کا قیام:

تاریخی طور پر ثابت ہے کہ مدینہ میں اسلام کی تخم ریزی اور اشاعت کا آغاز ہجرت سے کئی سال قبل ہو چکا تھا اور وہاں کے لوگ عرب کے دوسرے قبیلوں کی بہ نسبت زیادہ آسانی اور تیز رفتاری کے ساتھ اسلام قبول کرتے جارہے تھے نیز یہ بات بھی طے ہے کہ مدینہ کے مخصوص سیاسی ماحول میں تغیر و تبدل کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔[1]

مدینہ کی آبادی مختلف عناصر پر مشتمل تھی۔ خصوصاً ایک طرف تو وہاں اوس اور خزرج کے قبائل اپنی تمام تر تقسیمات کے ساتھ موجود تھے تو دوسری طرف یہود کے متعدد قبائل بھی رہتے تھے لیکن عددی اکثریت کے اعتبار سے ابنائے قیلہ یعنی اوس اور خزرج ہی فوقیت رکھتے تھے بلکہ کچھ عرصہ پہلے تک ان ہی کو سیاسی واجتماعی لحاظ سے یہود پر واقعی برتری حاصل تھی۔ لیکن جنگ بعاث کے نتیجہ میں اوس اور خزرج اس قدر تباہ حال ہو گئے کہ آخر کار یہود جو مذہبی برتری کے پہلے ہی مدعی تھے، اقتصادی وسیاسی لحاظ سے بھی ان سے آگے بڑھ گئے اور اس طرح مدینہ کی سیادت و قیادت اوس اور خزرج کے ہاتھوں سے نکل کر یہود کو منتقل ہو گئی۔[2]

اس صورت حال نے مدینہ کے معاشرہ پر گہرے اثرات مرتب کئے اور مدنی سیاست کو ایک نیا رخ عطا کیا۔ اس میں شک نہیں کہ جنگ بعاث سے پہلے بھی وہاں قبائلی خود مختاری وآزادی، باہمی عصبیت وعداوت، افتراق وانتشار کا دور دورہ تھا، کوئی مرکزی اقتدار کوئی قوت قاہرہ، کوئی عدالت مرافعہ نہ تھی نہ ہی کوئی متعین ضابطہ وہاں مروج تھا۔ مختصر یہ کہ زندگی وہاں ناممکن تھی، پھر بھی لوگ زندہ تھے البتہ جنگ بعاث کے تاریخی حادثہ نے اہل مدینہ کے ضبط و تحمل کے بند توڑ دیئے۔ اہل مدینہ اس حالت سے بالکل بیزار ہو کر

1- ***عہد نبوی میں ریاست کا نشوو ارتقاء***، ص134۔

2- ایضاً ص36-135

امن وآشتی کے طلبگار، انقلاب کے متمنی اور ایک منظم حکومت کے خواہش مند تھے اور ان کی اُس وقت کی سب سے بڑی ضرورت "اتحاد" تھی۔ چنانچہ 10 نبوی میں جب اہل خزرج کا ایک قافلہ موسم حج پر زیارت کعبہ کے لیے مکہ مکرمہ پہنچا تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے ملاقات کی جس کے نتیجہ میں چھ آدمی حلقہ بگوش اسلام ہوگئے (بیعت عقبہ اولی) اس پہلی ملاقات میں اہل مدینہ نے جو کچھ کہا وہ انتہائی قابل غور ہے، انھوں نے کہا تھا "یارسول اللہ ﷺ ہم اپنے پیچھے ایسی قوم کو چھوڑ کر آئے ہیں جس میں فتنہ وعداوت اس قدر ہے کہ کسی دوسری قوم میں اس کی مثال نہیں ملتی، شاید آپ ﷺ کے ذریعہ سے اللہ انہیں باہم متحد کردے، ہم ان کے پاس جائیں گے اور آپ کے معاملہ (نبوت) کی جانب بھی مدعو کریں گے اور انھیں بھی آپ کے اس دین کی طرف دعوت دیں گے جو ہم نے قبول کرلیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں آپ ﷺ پر متحد و متفق کردیا تو آپ سے زیادہ باعزت کوئی دوسرا نہ ہوگا۔"[1] اور پھر ایسا ہی ہوا کہ وہ لوگ جب واپس آئے تو پورے جذبہ وخلوص کے ساتھ اسلام کا برملا اظہار کرنے لگے۔ مدینہ میں جس نے اس پیغام کو سنا متاثر ہوا اور پھر کچھ ہی عرصہ میں اوس وخزرج کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں آنحضور ﷺ کا ذکر نہ ہوا ہو۔ پورا سال حضور اکرم ﷺ کی شخصیت ان کا موضوع گفتگو بنی رہی۔[2]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اگلے سال یعنی 11 نبوی میں (اہل مدینہ بیعت عقبہ دوم میں) آپ سے ملے تو ان کی تعداد 12 تھی اور انہوں نے آپ ﷺ کے ہاتھ پر شرک، چوری، زنا، قتل اولاد اور ناحق افتراء پردازی سے بچنے اور حضور ﷺ کے حکم سے کسی حال میں سرتابی نہ کرنے کا عہد استوار کیا۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کے سامنے اہل مدینہ نے جن باتوں سے مجتنب رہنے کا عہد کیا تھا وہ باتیں درحقیقت ایسی بنیادی خرابیاں تھیں جو اس معاشرہ میں پائی جاتی تھیں۔ اس بیعت کے ذریعہ وہ گویا ایک ایسے معاشرہ کے قیام کا اقرار کررہے تھے جس کی بنیاد توحید پر قائم ہو جہاں امانت ودیانت ہو اور جہاں دوسروں کی جان ومال اور عزت وآبرو کو محترم سمجھا جائے۔ اہل مدینہ نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ ان کے ہاں کوئی معلم بھیجا جائے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان کی خواہش کے مطابق حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بطور معلم مدینہ روانہ فرمادیا۔[3]

1- **عہد نبوی میں ریاست کا نشوو ارتقاء**، ص 36-135

2- ایضاً ص 138

3- ایضاً

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مدینہ پہنچ کر اپنی شبانہ روز کوششوں سے تبلیغ واشاعت کے ساتھ ساتھ مدینہ کے اہل ایمان کی نمازوں کی امامت بھی فرماتے تھے۔ یہ امامت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ ان کی اقتداء میں اوس، خزرج اور ایسے قبائل کے افراد شانہ بہ شانہ کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے تھے جو ابھی چند سال قبل تک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور جو اپنی عداوت کو اس حد تک نہیں پھیلا سکتے تھے کہ آپس میں ہی ایک دوسرے کی امامت قبول کر لیں۔ لیکن حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کی امامت ان کے لیے باعث اتحاد ثابت ہو رہی تھی۔ بدترین دشمنوں کا ایک جگہ ایک صف میں اس طرح مجتمع ہو جانا اتنا بڑا انقلاب تھا جس کا جاہلی معاشرہ میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسی لیے قرآن نے بطور احسان خداوندی کے اس خوشگوار انقلاب پر یوں تبصرہ کیا ہے {وَٱعۡتَصِمُواْ بِحَبۡلِ ٱللَّهِ جَمِيعٗا وَلَا تَفَرَّقُواْۚ وَٱذۡكُرُواْ نِعۡمَتَ ٱللَّهِ عَلَيۡكُمۡ إِذۡ كُنتُمۡ أَعۡدَآءٗ فَأَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوبِكُمۡ فَأَصۡبَحۡتُم بِنِعۡمَتِهِۦٓ إِخۡوَٰنٗا وَكُنتُمۡ عَلَىٰ شَفَا حُفۡرَةٖ مِّنَ ٱلنَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنۡهَاۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمۡ ءَايَٰتِهِۦ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُونَ ١٠٣}[1] مدنی معاشرہ کے ایک اور اہم اور بااثر عنصر یہود نے بھی اس انقلاب کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ یہود کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ اوس اور خزرج کے جنگجو اور خونخوار قبائل یوں آسانی سے اسلام اور ایمان کی بنیاد پر متحد و متفق ہو جائیں گے اور کفر وشرک، قتل اولاد، زنا اور اس قسم کی دوسری عادات قبیحہ کو ترک کر کے اطاعت وانقیاد کی روش اختیار کر لیں گے۔[2] یہود نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ اب وہ پہلے کی طرح اوس وخزرج کے درمیان نفرت وعداوت پیدا نہیں کر سکتے اور نہ انہیں لڑا سکتے ہیں۔ دوسری طرف اوس اور خزرج میں بھی بلند حوصلگی پیدا ہو گئی اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ جس طرح اسلام قبول کر کے وہ یہود کے مقابلہ میں دینی، مذہبی برتری حاصل کر چکے ہیں اسی طرح ان سے قیادت بھی چھین سکتے ہیں۔ تیسری طرف اوس وخزرج جیسے قبائل کے درمیان جوں جوں اتحاد وموافقت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ان کے نزدیک محبوب سے محبوب تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

بیعت عقبہ کبیرہ کے موقع پر حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مکہ واپس آئے تو مدینہ کے تمام حالات سے مطلع کیا۔ اہل مدینہ کا وفد ساتھ تھا جو ستر سے زائد نفوس پر مشتمل تھا۔ اس موقع پر وہ تاریخ ساز

1۔ سورۃ آل عمران:103

2- **عہد نبوی میں ریاست کا نشوو ارتقاء**، ص139۔

بیعت، معاہدۂ عمرانی منعقد ہوا جو پوری رضا اور رغبت سے انجام پایا اور دوطرفہ باہمی عہد وپیمان کا قول و قرار ہوا۔ اس طرح جب معاہدہ کی تکمیل ہوگئی تو آنحضرت ﷺ نے مبلغین ومعاہدین سے فرمایا کہ حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل میں سے بارہ نقیب منتخب کئے تھے تم بھی اپنی جماعت میں سے بارہ آدمی منتخب کرو۔ پھر جب نقباء کا انتخاب ہو چکا تو آپ ﷺ نے انہیں اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا۔ اس پر بلاذری کی روایت کے مطابق ایک ایک نقیب نے کھڑے ہو کر حمد وثناء اور اتباع نبوی ﷺ کا اقرار کیا اور اس بات کا حلف اٹھایا کہ وہ آنحضرت ﷺ کی دعوت پر لبیک کہیں گے ان کی مدد ونصرت کریں گے اور اپنے عہد ووفا کا پاس ولحاظ کریں گے۔[1] اہل یثرب کی تجویز پر آنحضرت ﷺ نے جن بارہ آدمیوں کو نقیب مقرر کیا تھا، یہ وہ لوگ تھے جو اپنے اپنے قبائل وبطون میں غیر معمولی اہمیت رکھتے تھے، مدنی معاشرہ میں اثرورسوخ کے مالک تھے اور اپنے قبیلے کے سردار یا کسی اہم ذمہ داری پر فائز تھے۔[2] معاہدۂ عقبہ کے ساتھ ساتھ نقباء کے تعین سے مدینہ میں باقاعدہ طور پر اجتماعی نظم کی بنیاد قائم ہوگئی اور نقیبوں کے ذریعہ منظم سیاسی معاشرہ کی تعمیر کا کام پوری طرح شروع ہوگیا۔

نبوی مدنی معاشرہ، تاسیس، تعمیر، تنظیم:

بیعت عقبہ کے فوراً بعد سے ہی مسلمان برابر ہجرت کر رہے تھے اور فی الواقع حضور ﷺ نے بھی سفر کی تیاریاں شروع کردی تھیں۔ لیکن اہل مکہ کی طرف سے بیعت عقبہ کے شدید ردعمل کے طور پر آپ ﷺ کے قتل کا فیصلہ آنحضرت ﷺ کی فوری روانگی کا سبب بن گیا۔ چنانچہ معاہدہ عقبہ (12 ذِالحجہ 12 نبوی) کے بعد محرم اور صفر کے دوماہ گزرے تھے کہ ربیع الاول 13 نبوی میں حضور نبی کریم ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی معیت میں مدینہ طیبہ روانہ ہوگئے۔ یہ روانگی آپ ﷺ کی اپنی ذاتی اور نجی حیثیت میں نہیں بلکہ اہل مدینہ کے تسلیم شدہ سیاسی قائد اور پیغمبر کی حیثیت سے تھی۔ اس قیادت، پیشوائی کا تقاضہ ایک تو یہ تھا کہ مدینہ کے تمام باشندوں کی قیادت ورہنمائی فرمائیں۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں میں سے جن لوگوں سے اپنا گھر بار مال ومتاع سب کچھ قربان کر کے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی ان کی معاشی آسودگی اور آبادکاری کا انتظام اور تیسرے اسلامی معاشرہ کی تنظیم اور اس کی سالمیت واتحاد کا مسئلہ بھی توجہ طلب تھا۔ یہ وہ مسائل تھے جو اپنی اہمیت کے اعتبار سے فوری حل کے متقاضی تھے۔

1- **عہد نبوی میں ریاست کا نشوو ارتقاء**، ص144۔

2- ایضاً، ص145۔

ان تمام مسائل کے حل کے لیے آپ ﷺ نے کوئی پیچیدہ طریقۂ کار اختیار نہیں فرمایا۔ بس سادہ سے چند اقدامات نے فوری حل کے ساتھ ساتھ دور رس ہمہ گیر اثرات مرتب کئے مثلاً 8 ربیع الاول کو قبا پہنچتے ہی آپ ﷺ نے مسجد قبا کی تعمیر فرمائی جو دنیا کی پہلی مسجد تھی اور جسے قرآنی الفاظ { لَّمَسۡجِدٌ أُسِّسَ عَلَى ٱلتَّقۡوَىٰ ﴿١٠٨﴾ } [1] کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے پھر چار دن بعد مدینہ منورہ میں داخلہ کے بعد اپنی جائے قیام پر پہنچ کر مسجد نبوی کی تاسیس و تعمیر آپ کے بڑے کارناموں میں سے ہے۔ اجتماعیت و معاشرت، تعلیم و تربیت اور مرکزیت پیدا کرنے کے لیے مسجد کا ادارہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مزید گوناگوں افادیت واہمیت کا حامل ہے۔ یہ تمام مسلمانوں کی ہمہ گیر اجتماعیت کے لیے بشمول مہاجرین وانصار، انتہائی اثر انگیز ثابت ہوا۔ باہمی میل جول، خیر وعافیت، معاونت، محبت، مودت، یگانگت اور تعمیل احکام اسلامی کے لیے بے مثال محرک وموئید تھا۔ مسجد نبوی کی تعمیر میں تو ظاہر ہے چھ سات مہینے لگے لیکن اس سے پہلے ہی ایک دوسرا قدم آپ ﷺ نے یہ اٹھایا کہ مہاجرین وانصار کے درمیان ایک عقد مواخاۃ قائم فرما دیا۔ یہ عقد "بر بنائے حق مواسات اور توارث" مہاجرین وانصار کے درمیان منعقد ہوا۔ ارشاد رسالت مآب تھا کہ اللہ کی راہ میں دو دو آدمی آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔ چنانچہ اس ارشاد کی تعمیل میں مہاجرین وانصار نے برضاورغبت ایک دوسرے کو اپنا بھائی بنایا اور اس سے اس طرح تعلقات استوار کئے جس طرح حقیقی بھائیوں سے ہوتے ہیں بلکہ بعض صورتوں میں تو انہوں نے حقیقی بھائیوں سے زیادہ برادری کا حق ادا کیا۔[2]

عقد مواخاۃ کا یہ واقعہ رجب 1 ھ میں پیش آیا۔ اس واقعہ نے مدینہ کی سیاسی معاشی اور معاشرتی زندگی میں اہم کردار ادا کیا جس کی تفصیل تو ایک مقالہ کی محتاج ہے۔ مختصراً یہ کہ اس سے ایک طرف تو بے سروسامان، غریب الدیار مہاجرین مکہ کی آبادکاری کا مسئلہ حل ہوگیا اور دوسری طرف ان کی معاشی کفالت کی ایک سبیل بھی پیدا ہوگئی۔ مہاجرین کو یہ فائدہ بھی پہنچا کہ ان کا احساس غربت دور ہوگیا وطن کی یاد، گھر بار عزیز واقارب سے چھٹنے کا فطری احساس وملال اور اجنبیت وغیرہ کا ہر خیال اپنائیت میں تبدیل ہوگیا۔ انصار نے عقبہ کی بیعت اور عہد کے مطابق نہ صرف یہ کہ نبی کریم ﷺ کو ہاتھوں ہاتھ لیا بلکہ آپ کے تمام جانثاروں کی خیر خواہی، دلدہی، ہمدردی، فراخدلانہ محبت، خلوص ایثار اور جذبۂ میں اپنے پرائے کی تمیز کا شائبہ بھی پیدا نہیں ہونے دیا اور انتہا یہ ہے کہ مہاجرین کو اس طرح وصیت اور وراثت میں بھی شامل کر لیا جس

1۔ سورۃ التوبۃ: 108

2- **عہد نبوی میں ریاست کا نشوو ارتقاء**، ص151

طرح ذوی الارحام حق دار ہوتے ہیں۔ اور یہ صورت حال اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ غزوۂ بدر کے بعد 2ھ میں سورۃ الانفال کی یہ آیت نازل نہ ہوئی کہ { وَأُوْلُواْ ٱلْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَٰبِ ٱللَّهِۚ إِنَّ ٱللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌۢ ۝٧٥ }(1)

عقد مواخاۃ نے اس بنیادی اصول کو "عہد تازہ" کی صورت میں پھر پیش کیا کہ انسانوں کے باہمی تعلق و ہم آہنگی، وابستگی اور اتحاد کی حقیقی بنیاد وطن رنگ نسل زبان وغیرہ نہیں بلکہ صرف دین اور حق ہے۔ اسی نکتہ کی تعلیم توحید کی پہلی دعوت میں دی گئی اور اسی کے ذریعہ آنحضور ﷺ نے اجنبی انسانوں کو اپنا بنایا اسی بنیاد پر ایک نئے معاشرہ کا وجود و قیام عمل میں آیا اور اب اس کی بنیاد پر اسکی تنظیم کی جارہی تھی۔ آرنلڈ نے لکھا ہے کہ "اس رشتہ سے تمام قبیلوں کے اختلافات معدوم ہو گئے اور ایک مشترک مذہبی زندگی نسلی رشتوں کی جگہ قائم ہو گئی۔(2)

مجموعی طور پر سب سے بڑا فائدہ اور عقد مواخاۃ کا گہرا اثر یہ ہوا کہ جس اسلامی معاشرہ کی داغ بیل مکہ مکرمہ میں پڑ چکی تھی اس کی ترتیب و تنظیم مکمل ہو گئی اور اس کے تمام ارکان تعلیم و تربیت پا کر اس قابل ہو گئے کہ اپنے جملہ معاشرتی تمدنی اور سیاسی فرائض کی بجا آوری اور اپنے حقوق کا تحفظ بہ احسن و خوبی کر سکیں۔(3)

نبوی مدنی معاشرہ۔توسیع و ارتقاء۔تشکیل ریاست:

بیعت عقبہ کے ذریعہ رسول ﷺ اور اہل مدینہ کے درمیان جس انداز و پیمانے پر سیاسی رابطہ استوار ہوا اور انھوں نے آنحضور ﷺ کی قیادت کو مکمل سمع و طاعت کے ساتھ جس طرح قبول کر لیا تھا اس کے بعد تو فی الواقع ضرورت اس امر کی رہ گئی تھی کہ کوئی قطعۂ اراضی زیر اثر آجائے جس میں کوئی اور سیاسی (اقتدار کار فرمانہ ہو) تو معاً ایک ریاست روبہ عمل آسکتی ہے۔

چنانچہ ہجرت مدینہ کے بعد ایک طرف تو مسلمانوں کی جماعت کو عقد مواخاۃ کے ذریعہ ایک منظم معاشرہ کی شکل دے دی گئی اور دوسری طرف ایک سرزمین بھی حاصل ہو گئی جہاں نراج کی وجہ سے کوئی باقاعدہ سیاسی اقتدار موجود نہ تھا گویا ریاست کے کل عناصر و لوازم میسر آگئے تو ابتدائی مسائل سے فارغ ہوتے ہی

1- **عہد نبوی میں ریاست کا نشوو ارتقاء**، ص153

2- ایضاً ص155

3- ایضاً ص156

آنحضرت ﷺ نے ہجرت کے پہلے ہی سال میں "ہیئت سیاسیہ" کی تکمیل کر لی اور ایک نوشتہ خاص کے ذریعہ مدینہ کی اسلامی ریاست کو وجود بخش دیا۔[1]

دنیا کی تاریخ میں کسی ریاست کا قیام تھوڑی بہت قوت استعمال کئے بغیر شاید ہی ہوا ہو لیکن یہ تاریخ کی کتنی بڑی حقیقت ہے کہ حضور ﷺ نے بالکل اجنبی ماحول میں باہم متضاد و منتشر عناصر کے تعاون سے نہ صرف ریاست بلکہ ایک نظریاتی ریاست کو قائم فرمایا اور پھر خاص بات یہ کہ اس تعاون کو آپ نے کسی طاقت، تشدد، یا جبر و ظلم کے بل بوتے پر نہیں بلکہ محض ایک نوشتہ کے ذریعہ حاصل کیا تھا۔[2]

یہ نوشتہ یا دستاویز جس کے زریعہ مدینہ ایک مکمل شہری ریاست کی شکل اختیار کر گیا اور جس میں حکمران ریاست اور اس کی رعایا کے حقوق و فرائض اور دیگر فوری ضروریات کا تفصیلی ذکر ہے۔ عام معنوں میں کوئی تحریر یا معاہدہ نہ تھا جیسے مختلف قبائل آپس میں پہلے محالفہ کر لیا کرتے تھے بلکہ دراصل وہ منشور تھا جو آنحضور ﷺ کی طرف سے باشندگان مدینہ کے لئے تھا اور اصلاً وہ فرمان (charter) تھا جو حکمران کی طرف سے رعایا کے لئے جاری کیا گیا۔ یہ تاریخی دستاویز جس کا متن مآخذ میں موجود ہے، تاسیسی ریاست کے ضمن میں آنحضور ﷺ کا وہ انقلابی قدم ہے جس کی نظیر پوری سیاسی تاریخ میں مشکل سے ہی ملے گی۔ اس نوشتہ کی بنا پر نہ صرف یہ کہ مدینہ میں ایک ریاست کی باضابطہ تاسیس ہو گئی بلکہ اس نوشتہ نے مدنی سیاست و معاشرت بلکہ پورے عرب کی سیاست و مدنیت پر انتہائی دور رس اثرات مرتب کئے۔[3] علاوہ ازیں اس دستاویز، منشور اور فرمان میں یہ امر بھی واضح ہے کہ اس کا اطلاق مدینہ میں رہنے والے تمام باشندوں اور تمام جماعتوں پر یکساں طور پر عائد ہوتا ہے یعنی مہاجرین، انصار، مشرکین اور یہود۔ اس منشور کے ابتدائی فقرے اس کی وسعت و ہمہ گیری کو متعین کر کے اس بات کی نفی کر دیتے ہیں کہ یہ یہودیوں سے معاہدہ قسم کی کوئی چیز تھا۔

بہر حال یہ بھی ایک امتیاز رحمۃ للعالمین ہے کہ ریاست کے وجود میں آنے کے بعد اس کے فرائض و مقاصد کی بجا آوری میں بھی آپ ﷺ نے پورے اشتغال و انہاک سے کام کیا اور یہ خیال رکھا کہ ریاست و معاشرہ کے ان اہداف کو حاصل کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی سرزد نہ ہونے پائے جیسے قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ حج میں ارشاد ہے {ٱلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّٰهُمۡ فِي ٱلۡأَرۡضِ أَقَامُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُاْ

1- **عہد نبوی میں ریاست کا نشوو ارتقاء**، ص157۔

2- ایضاً۔

3- ایضاً ص168۔

ٱلزَّكَوٰةَ وَأَمَرُواْ بِٱلْمَعْرُوفِ وَنَهَوْاْ عَنِ ٱلْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَـٰقِبَةُ ٱلْأُمُورِ ﴿٤١﴾ }[1]

یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں زمین میں صاحب اقتدار کر دیا تو وہ نماز قائم کریں گے، ادائے زکوۃ میں سرگرم ہوں گے نیکیوں کا حکم دیں گے اور برائیوں سے روکیں گے۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ صاحب اقتدار ہونے کے بعد آپ ﷺ نے حسب ضرورت اور حسب موقع معاشرہ کی کارکردگی اور صلاح و فلاح کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے تمام انتظامات کو حتمی شکل دے کر اعلیٰ ترین اقدامات فرمائے۔

یہاں تک کہ مدنی معاشرہ جہاں پہلے امن و امان عنقاء تھا، جہاں نراج کی کیفیت برس ہا برس سے قائم تھی وہاں آنحضور ﷺ سربراہ حکومت ہی سے امن و امان، چین و سکون کا دور دورہ ہو گیا۔ اسے حرم قرار دیا گیا جہاں قتل و غارت گری تو درکنار وہاں ہر قسم کا لڑائی جھگڑا فتنہ و فساد ممنوع ٹھہرا اور انسان تو انسان، جاندار و بے جان ،درخت، پیڑ، پودے اور وہاں کی گھاس تک اکھاڑنا یا اسے نقصان پہنچانا روا نہیں رکھا گیا۔ آنحضور ﷺ کی تعلیمات اور اسلامی ریاست کے انتظامات اس بات کی ضمانت تھے کہ معاشرہ میں انسانوں اور مسلمانوں کے حقوق کی پاسداری کی جائیگی، فرائض کی بجا آوری ہو گی اور بالآخر صلاح و فلاح معاشرہ کے مقاصد حاصل کیے جائیں گے۔ ہجرت مدینہ پر بمشکل آٹھ سال ہی گزرے تھے کہ خانۂ کعبہ پھر سے توحید کا مرکز بن گیا اسے ہر قسم کے معبودان باطل سے پاک کر دیا گیا۔ {جَآءَ ٱلْحَقُّ وَزَهَقَ ٱلْبَـٰطِلُ ۚ ﴿٨١﴾ }[2] کا منظر ہر ایک نے دیکھا اور پھر آپ ﷺ کے پردہ فرمانے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کی مرضی اسی طرح سے زمین پر پوری ہونے لگی جس طرح آسمان پر ہوتی ہے اور مثالی معاشرہ وجود پذیر ہو گیا، جس کی برکتوں، سعادتوں سے تمام رہنے والے باشندے متمتع ہو رہے تھے اور جو آنے والے ہر زمانے کے لیے ایک مثال اور نمونے کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر صلاح و فلاح معاشرہ کا کوئی مفہوم ہے تو اس کی حقیقی تعبیر عہد رسالت مآب ﷺ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

وصلی اللہ تعالی علیه وآله واصحابه وازواجه وذریاته اجمعین، برحمتک یا ارحم الراحمین، سبحان ربک رب العزة عما یصفون وسلام علی المرسلین والحمد للہ رب العالمین۔

1۔ سورۃ الحج:41

2۔ سورۃ الإسراء:81